

جاسوسی دنیا نمبر 54

قاسم اور وہ لڑکیاں

گرائیل احمق قاسم راجرس اسٹریٹ کے موڑ پر بڑی دیر سے ان دونوں لڑکیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اب تک درجنوں بار ان کا تعاقب کر چکا تھا۔ وہ لڑکیاں راجرس اسٹریٹ ہی میں کہیں رہتی تھیں لیکن قاسم ان کے گھروں سے ناواقف تھا۔ اس کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ راجرس اسٹریٹ کے اندر قدم بھی رکھتا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں اس کے باپ کے کئی شناسا رہتے تھے اور قاسم اپنے باپ سے بھی زیادہ اس کے ہنر سے ڈرتا تھا اور ہنر بھی ایسا نامعقول تھا کہ صرف لڑکیوں ہی کے معاملے میں بہت زیادہ چاق و چوبند ہو جایا کرتا تھا۔ قاسم کی بیوی دراصل اس کے باپ کی بھتیجی تھی اور قاسم کا کہنا تھا کہ وہ اس کی سب کچھ ہو سکتی تھی لیکن بیوی کبھی نہیں ہو سکتی..... ہاں تو وہ ہنر صرف قاسم کی بیوی کے تحفظ کے لئے تھا۔

لیکن جسے کیپٹن حمید دھکا دے جائے اُسے ڈوبنے سے کون بچا سکتا ہے۔ قاسم آج کل دراصل اسی کی نصیحت پر عمل کر رہا تھا۔ یہ مشورہ اسی کا تھا کہ قاسم لڑکیوں کا تعاقب کیا کرے، کبھی تو کسی کا دل پیسے گا۔ قاسم نے بھی سوچا ہرج ہی کیا ہے اس میں۔ کسی قسم کے دھوکے کا بھی امکان نہیں۔ دھوکے کا امکان اُس صورت میں ہوتا جب حمید یہ کہتا کہ ہم دونوں مل کر

خونخوار لڑکیاں

(مکمل ناول)

لڑکیوں کا تعاقب کریں گے۔ اس پر تو وہ قیامت تک راضی نہ ہوتا کیونکہ کئی بار حمید کے چکر میں پڑ کر اپنی حجامت بنوا چکا تھا۔

بہر حال قاسم نے ایک چھوٹے دو لڑکیوں کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ ایک نہیں تو دوسری ضرور پیچھے گی۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ پندرہ دن گذر جانے کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ہو۔

یہ دونوں لڑکیاں اُسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اچھے لگنے کی وجہ ان کی خوبصورتی نہیں تھی، خوبصورت تو وہ تھیں ہی نہیں، بس یونہی معمولی ساناک نقشہ تھا۔ قاسم کو وہ اس لئے پسند آئی تھیں کہ اس کے الفاظ میں ”خاصی ٹکڑی تھیں۔“

وہ صبح نو بجے ہی راجرس اسریت کے موٹر پر آ جایا کرتا تھا۔ حالانکہ لڑکیاں دس بجے سے پہلے نہیں آتی تھیں۔

آج بھی وہ ٹھیک نو بجے ہی وہاں پہنچا تھا۔ مگر آدھے گھنٹے تک انتظار کرتے رہنے کے بعد اچانک اُسے یاد آیا کہ آج تو اتوار ہے۔ وہ کالج نہیں جائیں گی۔ یہ سوچ کر قاسم کے دل میں اداسی کے بادل چھا گئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دل ہی دل میں اپنے باپ کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ جس کی بدولت اُسے لڑکیوں کے پیچھے کٹوں کی طرح مارا مارا پھرنا پڑتا تھا۔ اگر اس نے اُس کی شادی کسی چھ فٹ اونچی اور کم از کم ڈھائی فٹ چوڑی عورت سے کی ہوتی تو آج اُس کی زندگی بھی کسی گھریلو قسم کے شریف آدمی کی طرح بسر ہو رہی ہوتی۔

دہلی پتلی لڑکیوں سے اُسے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ وہ ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا خواہ وہ اندر کے اکھاڑے کی پریاں ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر کبھی کسی دہلی پتلی لڑکی پر نظر بھی پڑ جاتی تو وہ نفرت سے ہونٹ سکڑ کر اس انداز میں بڑبڑانے لگتا جیسے اس کی ہڈیاں سلگ رہی ہوں۔ ایسے مواقع پر اگر کوئی اس کے قریب ہوتا تو اُسے یہ الفاظ ضرور سنائی دیتے۔

”ایسی ہو تو مر ہی کیوں نہیں جاتیں۔ زمین کا بوجھ ہلکا کر دو۔ خدا کرے ٹی بی ہو جائے۔ جو لمبے میں جاؤ۔“ وہ اسی طرح ناک سکڑ سکڑ کر بڑبڑاتا ہوا اس کے قریب سے گذر جاتا۔

اس وقت بھی وہ بڑبڑا رہا تھا۔ یعنی اپنے باپ کے متعلق زبان سے کچھ سوچ رہا تھا۔ اکثر

وہ زبان سے بھی سوچنے لگتا تھا لیکن جس دن اُسے اس کی ذہنی حالت زبان سے سوچنے پر مجبور کرتی تھی اُس دن کسی نہ کسی سے اس کا جھگڑا ضرور ہو جاتا تھا۔ وہ راجرس اسریت کے موٹر سے ہٹ کر سڑک کی دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر چلا گیا۔ سامنے ہی ایک کتاب فروش کی دکان تھی جس کے شوکیس میں چمچھاتے ہوئے مغربی رسائل رکھے ہوئے تھے۔ وہ جھک کر ان کے سروراق کی نیم عریاں تصویریں دیکھنے لگتا۔ ان میں کچھ رسائل کھیل کود سے متعلق بھی تھے ایک پر اسے ایک گھونسلہ بازی کی تصویر نظر آئی جو اپنے ہاتھوں میں گھونسلے بازی کے دستانے پہنے ہوئے ایسے انداز میں کھڑا تھا جیسے اپنے حریف پر حملہ کرنے یا اس کا حملہ روکنے جا رہا ہو۔ تصویر کو دیکھتے دیکھتے قاسم کی ذہنی رو بہک گئی اور وہ یہ بھول کر کہ ایک دکان کے سامنے کھڑا ہے تصویر ہی کا سا پوز بنانے لگا۔

دوکاندار نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ دو ایک راگبیر بھی رک گئے اور پھر اچانک قاسم کو بھی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اس نے عجیب طرح کا منہ بنایا اور پھر بوکھلائے ہوئے انداز میں دوکاندار سے پوچھا۔

”تھنے..... کتنے قاتل..... ہے بھائی۔“

”کیا چیز جناب۔“ دوکاندار نے مسکرا کر پوچھا۔

اس کی مسکراہٹ قاسم کو زہر ہی لگی اور اُسے غصہ آ گیا۔

”اے یہاں کتابوں اور کسالوں..... رسالوں کے علاوہ اور کیا ہے۔“ قاسم دہاڑا۔

”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔“ دوکاندار نے بھی اپنے نتھنے پھلائے۔

قاسم کو اس کا لہجہ اتنا برا لگا کہ اُس نے اس کے سر پر دو ہتھوڑا رسید کر دیا۔

دو ہتھوڑا اور قاسم جیسے دیوڑادکا۔ خدا کی پناہ..... دوکاندار کے حلق سے ایک میساختہ قسم کی کراہ نکلی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جان پہچان والے ہاں ہاں کر کے دوڑے..... اور قاسم پینتربدل کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ تو وہ تھا ہی کر یک اور کچھ اس بات کا خیال آ گیا تھا کہ نگاراں خوبرو کی گلی کے سامنے آن نہ جانے پائے۔ ایک مجھول سے آدمی نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش

کی لیکن دوسرے ہی لمحے میں قاسم کا بھرپور تھپڑ اُسے سڑک پر لے گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے قاسم پر یورش کر دی۔ قاسم جم کر لڑ تو سکتا تھا لیکن اپنے ہاتھی جیسے ذیل ڈول کی بناء پر بھاگ نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ جنگ مغلوبہ کی صورت میں بھاگ نکلنا ہی زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

دو ہی چار ہاتھ چلانے کے بعد قاسم کو خیال آیا کہ ایسے میں وہ دونوں لڑکیاں نہ آجائیں اگر انہوں نے اسے اس طرح ہاتھ پائی کرتے دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گی کہ وہ کوئی لوفر ہے۔ ذہنی روکا ہو سکتا تھا کہ اس کے قالب میں سعادت مندی حلول کرنے لگی۔ ہاتھ ست پڑنے لگے ظاہر ہے ایسی صورت میں پٹ جانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب اُس پر چاروں طرف سے تھپڑ اور گھونے پڑنے لگے مگر وہ سب اس کے سامنے باشتیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نیک نفس اور شریہا تھی کو چند شریر بچے چھیڑ رہے ہیں۔ قاسم ان کے وار اپنے بازوؤں پر روک روک کر انہیں اس انداز میں پیچھے دھکیل رہا تھا جیسے وہ سب کچھ مذاق ہی رہا ہو۔

پھر اچانک قریب ہی ایک دوسرا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ شاید وہ اس سے بھی زیادہ اہم تھا کیونکہ قاسم کی بھیڑ دوسری طرف بھاگنے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے قاسم وہاں تنہا رہ گیا۔ لوگ اپنی دوکانیں چھوڑ چھوڑ کر جمع کی طرف جارہے تھے اور قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

وہ یوں بھی کافی لمبا تھا اور اس وقت فٹ پاتھ پر کھڑا تھا، جو سڑک سے تقریباً ایک فٹ اونچی ضرور رہی ہوگی۔ بہر حال وہ مجمع کے اندر کا حال بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

مجمع میں اُسے وہی دونوں لڑکیاں نظر آئیں..... مگر عجیب حال میں..... وہ پاگلوں کی طرح اچھل اچھل کر ہاتھ میں آئی ہوئی چیزیں کلاک ٹاور کی طرف پھینک رہی تھیں۔ اپنے سینڈل، فاونٹین پن، سڑک پر پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے، جو کچھ بھی ہاتھ لگا کلاک ٹاور کی گھڑی پر کھینچ مارا۔ ان کی زبان سے گالیوں کے طوفان امنڈ رہے تھے۔

قاسم بُری طرح بدحواس نظر آنے لگا لیکن اچانک اس کی کھوپڑی کی تاریکیوں میں ایک نیا

خیال طلوع ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہیں انہوں نے اس کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے تو یہ سب کچھ نہیں کیا۔ عورت کے معاملے میں بڑے بڑے افلاطونوں کا منطقی شعور مردہ ہو جاتا ہے، پھر وہ بیچارہ تو پیدا آئی ہوئی تھا۔ یہ خیال اُسکے ذہن میں ابھرا اور پتھر کی لکیر کی طرح اٹل ہو گیا۔

خوابوں کے جزیرے کی پریاں اس کا سر سہلانے لگیں اور اس کے ریشے ریشے میں محبت انگڑائیاں لینے لگی۔ ان دونوں لڑکیوں کی محبت جنہوں نے مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اسے بچانے کے لئے اس طرح رسوا ہونا گوارا کر لیا تھا۔ دریائے محبت جوش میں آیا اور قاسم بھیڑ کو چیرتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

”بس بس جانے دیجئے۔ میں کیا ان سالوں سے ڈرتا ہوں۔“ قاسم خلاف عادت بہت روانی کے ساتھ بولا۔ ورنہ وہ لڑکیوں سے گفتگو کرتے وقت عموماً ہکھلانے لگتا تھا۔

”ہاٹ..... سامنے سے۔“ ایک لڑکی نے اچھل کر اپنا ہاتھ گھما دیا اور وہ ہاتھ براہ راست قاسم کے داہنے گال پر پڑا۔ دوسری طرف سی دوسری لڑکی نے حملہ کیا۔

”ہائیں..... ہائیں..... ارے.....!“ قاسم بوکھلا کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اچانک ایک نے اچھل کر قاسم کے بال پکڑے اور پوری قوت سے نیچے کی طرف جھکانے لگی۔ اسے اس میں کچھ دشواری بھی نہیں ہوئی کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی، ایسی لڑکی جس کا تعاقب وہ عرصے تک کرتا رہا تھا۔ وہ کوئی مرد نہیں تھا جسے قاسم کی ایک ہی ضرب موت کے گھاٹ اتار دیتی۔

قاسم ہکھلاتا ہوا جھکتا چلا گیا۔ دوسری لڑکی اس کی پشت پر گھونے برسانے لگی۔

لوگوں نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا..... قہقہے اور تالیاں.....!

قاسم کا یہ عالم تھا کہ اب اس کی ہکھلاہٹ بھی بند ہو گئی تھی۔ پھر اچانک پولیس آ گئی جس کے ساتھ زباناؤں کی تین لڑکیاں بھی تھیں۔ حلقے کا تھانہ یہاں سے قریب ہی تھا اور آج کل ہر تھانے پر زباناؤں کی دو تین لڑکیاں ضرور رہتی تھیں۔ شہر کے حالات ہی کچھ ایسے تھے۔

ان لڑکیوں نے قاسم کا پیچھا چھڑایا اور انہیں ان وحشی لڑکیوں کو قابو میں لانے کے لئے بھی زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی کیونکہ پولیس کو دیکھتے ہی ان کی حالت میں حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سوتے سوتے جاگ پڑی ہوں اور اب ان کے

چہرے پر خوف کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔

”آپ کون ہیں؟“ سب انپکٹر نے قاسم سے پوچھا جسے اپنے کپڑے جھاڑنے تک ہوش نہیں تھا۔

”مم..... میں.....!“ قاسم تھوک نکل کر رہ گیا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ ایک آدمی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ یہ وہی دوکاندار تھا جس کے سر پر قاسم نے کچھ دیر قبل دو تھوڑا سا سید کیا تھا۔

”جناب.....!“ اس نے سب انپکٹر سے کہا۔ ”یہ حضرت بھی پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ دو تین آدمیوں کو مارا تھا۔ آپ دوسروں سے دریافت کر سکتے ہیں۔“

”اے بھگ..... تو نے بھی تو..... بد تیزی کی تھی۔“ قاسم ہانپتا ہوا دہاڑا۔

”دیکھا آپ نے..... کیا یہ شریفوں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں۔“ دوکاندار نے سب انپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس چلے جاؤ..... ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں۔“ دفعتاً سب انپکٹر نے قاسم کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”آپ بھی ذرا ہوش ہی میں رہنے گا، جی ہاں۔ میں کسی بننے کا لونڈا نہیں ہوں۔“

”چلو.....!“ سب انپکٹر نے اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولا۔ ”انہیں گاڑی میں بٹھاؤ۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔“ قاسم دہاڑا۔ ”تم مجھے اس طرح نہیں لے جا سکتے۔ میں اپنی کار

میں جاؤں گا۔“

”تمہاری کار..... شاید ابھی دماغ قابو میں نہیں آیا۔“ سب انپکٹر تلخ سی ہنسی کیا تھا بولا۔

”کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو۔“ قاسم غرایا۔ ”تم مجھے اس طرح نہیں لے جا سکتے۔ اگر میری

کار غائب ہوگئی تو تم زندگی بھر کمانے کے بعد بھی اس کی قیمت ادا نہ کر سکو گے..... ہاں۔“

”یہ حقیقت تھی کہ قاسم یہاں تک اپنی شاندار بیوک میں آیا کرتا تھا اور اُسے راجس

اسٹریٹ سے ایک فرلانگ پیچھے چھوڑ کر خود پیدل یہاں تک آتا اور لڑکیوں کی آمد کا منتظر رہتا۔

جیسے ہی وہ لڑکیاں راجس اسٹریٹ سے نکل کر سڑک پر آتیں انکا تعاقب بھی پیدل ہی ہوتا تھا۔

”دھکا دے کر گاڑی میں بٹھاؤ۔“ سب انپکٹر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر گر جا۔

”بیچھڑانا پڑے گا۔ میں بتائے دیتا ہوں۔“ قاسم ہوا میں مکاٹا ہوا بولا۔ ”میں کہتا ہوں

کہ میں اپنی گاڑی ہی میں بیٹھ کر کہیں جا سکتا ہوں۔“

سب انپکٹر چند لمحے اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”کہاں ہے گاڑی۔“

”اُدھر.....!“ قاسم نے مجھے کے اوپر سے مخالف سمت میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

سب انپکٹر نے ایک کانٹیل کو ساتھ جانے کا اشارہ کیا۔ قاسم آگے بڑھ کر لوگوں کو ہٹاتا

ہوا نکلا چلا گیا۔ لیکن اب اس کے حواس گم تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ اُسے تھانے لے

جائیں گے، بات بڑھے گی، پھیلے گی پھر اگر اُس کے باپ کے کانوں تک یہ خبر گئی تو بارات ہی

چڑھ جائے گی۔

چڑے کا ہنر قاسم کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ معاملہ لڑکیوں کا تھا وہ اپنی کار

کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ کانٹیل بھی قریب پہنچ گیا تھا، وہ اسے اس شاندار بیوک کے قریب

رکا ہوا دیکھ کر جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگا۔

”تم کس کے ڈرائیور ہو.....!“ اس نے قاسم سے پوچھا۔

”ہائیں..... ڈرائیور.....!“ قاسم آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”میں اپنا ڈرائیور ہوں۔ اب تم

سے کیا بات کروں، اپنے سب سے بڑے آفیسر کے پاس لے چلو۔“

”آئی جی صاحب آج کل دورے پر ہیں۔“ کانٹیل نے احمقانہ انداز میں کہا۔

”کون بائی جی۔“

”آئی جی..... آئی جی۔“

”کوئی بھی ہوں، مجھے کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔“ قاسم غرایا۔ لیکن ذہنی طور پر وہ اس

وقت ایک خرگوش سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ اچانک ایک خیال بڑی تیزی سے اُس کے ذہن میں

اُبھرا اور اس نے کانٹیل سے کہا۔

”میں فون کرنا چاہتا ہوں۔“

”دیر ہو رہی ہے، داروغہ جی مجھے کھا جائیں گے۔“

”میں تمہیں مالا مال کر دوں گا پیارے..... بس دو منٹ..... میرے ساتھ سامنے واس
ریستوران تک چلو۔“

”دیر نہ کیجئے گا۔“

”نہیں پیارے الا قسم.....!“

قاسم تیزی سے سڑک پار کرنے لگا۔ اس وقت بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی سڑک
کوٹنے والے انجن میں تیز رفتاری پیدا ہوگئی ہو۔ کانشیل سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا
تھا۔ قاسم اتنا بدحواس تھا کہ اس نے ریسٹوران میں پہنچ کر کاؤنٹر کلرک کی اجازت کے بغیر ہی
نمبر ڈائیکل کرنے شروع کر دیئے۔

”ہیلو.....!“ وہ ماؤتھ پیس میں دہاڑا۔ ”اس کی آواز حلق کے بجائے بلغم بھرے ہوئے
پھیپھڑوں سے نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔“

”ہیلو! کون صاحب بول رہے ہیں۔ کون حمید بھائی..... آہا..... میں بول رہا ہوں.....
قاسم قاسم!..... خدا کے لئے مجھے بچاؤ..... میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھے پرنسٹن کے
تھانے میں لے جا رہے ہیں۔“

”تم کہاں سے بول رہے ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”یہاں سے۔“

”ابے کہاں سے..... جگہ کا نام..... ڈیوٹ.....!“

”میں ڈیوٹ..... میرا باپ ڈیوٹ..... حمید بھائی..... بس آ جاؤ۔ میں راجرس اسٹریٹ
کے قریب والے ریسٹوران کیا نام ہے..... کیا تم..... کیفے حلٹھنڈے سے بول رہا ہوں۔ وہ
یار کچھ گھپلا ہو گیا ہے۔ دولڑکیاں بھی ہیں۔“

”ارے! تو کیا وہ تم ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”وہی لڑکیاں تو نہیں، جنہوں
نے کلاک ٹاور پر پتھر برسائے ہیں۔“

”وہی..... وہی..... الا قسم حمید بھائی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خود کشی کر لوں۔“

”میری موجودگی میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ پیچھے کھڑے ہوئے کانشیل نے کہا۔
”اماں نہیں بھائی میں مذاق کر رہا تھا۔“ قاسم نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر کہا۔
”کیا.....؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”مجھے بچاؤ..... حمید بھائی۔“

”تم گدھے ہو، میرا وقت برباد نہ کرو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔
”خدا تمہیں غارت کرے۔“ قاسم ریسپورر رکھ کر کانشیل کی طرف پلٹا۔ چند لمحے اسے قہر
آلود نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”تم نے سچ میں بول کر کبڑا کر دیا۔“
”میں نے کیا کیا۔“ کانشیل کی تیوریاں بھی چڑھ گئیں۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں..... وہ سمجھا شاید میں نے اس سے کہا
ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔“

”کون نہیں آئے گا۔“

”تھکے سراغ رسانی کا کیپٹن حمید۔“

”آپ انہیں کیا جانیں۔“

”کیوں نہ جانوں..... تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے۔“

”اچھا چلے..... دیر ہو رہی ہے۔“

قاسم نے جھنجھلا کر اسے ایک موٹی سی گالی دینی چاہی لیکن یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ موٹی سی
عقل اس موٹی سی گالی پر غالب آ گئی۔ چونکہ کانشیل کی بالائی منزل کی چھت سرخ رنگ کی تھی
اور قاسم اسے عینک کے بغیر بھی صاف دیکھ سکتا تھا، اس لئے اس کے منہ سے گالی نہ نکل سکی،
ہو سکتا ہے بچپن میں وہ سرخ پگڑیوں سے خوف ہی کھاتا رہا ہو۔ سب انسپکٹر کی خاکی پگڑی سی وہ
ذرا برابر بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔

بہر حال تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار سمیت پرنسٹن کے تھانے میں پہنچ گیا۔

انچارج نے نیچے سے اوپر تک دیکھ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر وہ اُن دونوں لڑکیوں کی
طرف متوجہ ہوا جو بہت زیادہ خائف اور ساتھ ہی ساتھ شرمندہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اُس

نے اُن سے کسی قسم کے سوالات نہیں کئے۔ قاسم سے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔

قاسم بار بار ان دونوں کو گھورنے لگتا تھا۔ وہ الجھن میں تھا۔ الجھن کی بات ہی تھی وہ تو سمجھا تھا کہ انہوں نے یہ حرکت محض اس لئے کی ہے کہ لوگ اس کا پیچھا چھوڑ کر اُن کی طرف متوجہ ہو جائیں، مگر پھر اُسے انہیں کے ہاتھوں پٹنا پڑا تھا۔ اس کا ذہن ان کے اس رویہ کو کوئی معنی نہ پہناسکا۔

”ہمیں کچھ کہنا ہے۔“ اچانک ایک لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں انچارج سے کہا۔

”مجھے سننا آتا ہی نہیں۔“ انچارج بے رخی سے بولا اور قاسم کو غصہ آ گیا۔ وہ ان لڑکیوں کی توہین کیسے برداشت کر لیتا جن کا تعاقب اتنے دنوں سے کرتا رہا تھا۔ غصے میں اس کی زبان ذرا کم لڑکھاتی تھی۔ اس لئے وہ اپنے مخصوص انداز میں دہاڑا۔

”آپ کو سننا پڑے گا۔“

”بس آپ تو خاموش ہی بیٹھے رہے۔“ انچارج نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اگر کرنل فریدی صاحب نے آپ کو بھی روکے رکھنے کے لئے نہ کہا ہوتا تو آپ کہیں اور ہوتے۔“

”کہاں ہوتا..... پھانسی کے تختے پر۔“ قاسم نے لڑکیوں کی طرف ہتھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہر وقت سینے پر گولی کھانے کے لئے تیار رہتا ہوں۔“

جنس مقابل کی موجودگی میں اچھے اچھے شیخیاں گھمارنے کے سلسلے میں اکثر انتہائی پھوہڑ پن کی باتیں کرنے لگتے ہیں، قاسم تو بیچارا تھا ہی ڈیوٹ۔

قاسم کی اس حماقت پر دو چار کوہنی آگئی اور کچھ اُسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگے، جن میں انچارج بھی شامل تھا۔ لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی قاسم اچھل کر کھڑا ہو گیا، کیونکہ اس نے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

پھر سب ہی کھڑے ہو گئے۔ فریدی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ حمید قاسم کو گھور رہا تھا۔ لیکن قاسم کا یہ عالم تھا کہ مسکرانے کے لئے اس کے ہونٹ نا کافی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ سارے جسم پر ہونٹ ہی ہونٹ بن جائیں، اور ان

سہوں پر مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہو۔ اس مسکراہٹ میں ایک خاموش چیلنج بھی تھا۔ ”ابے دیکھ ایک چھوڑ دو لڑکیاں۔“

دھونس جمانے والی

حمید کو بھی دراصل اسی بات پر حیرت تھی۔ ایک چھوڑ دو لڑکیاں اور وہ بھی ایسی، جو قاسم کے معیار پر سو فیصد پوری اترنے والی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قاسم کو کب سے اس کا سلیقہ ہوا۔ ان معاملات میں وہ اسے بالکل گاؤدی تصور کرتا تھا۔

فریدی اُس سب انسپکٹر سے واقعات سن رہا تھا، جس نے انہیں موقعہ واردات پر پکڑا تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی اس نے پھر اُن لڑکیوں کی طرف دیکھا لیکن پھر فوراً ہی قاسم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میرے ساتھ آؤ.....“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ قاسم بوکھلا کر ایک کرسی کے پائے سے الجھ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس بار اُن خوفزدہ لڑکیوں کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ قاسم خود ہی اٹھا کسی نے اُس کی مدد نہیں کی۔ فریدی ایک ایسے کمرے میں داخل ہوا جو خالی تھا، قاسم گرتا پڑتا وہاں پہنچا۔ اس کے بعد ہی حمید بھی پہنچ گیا۔

”یہ لڑکیاں تمہارے ساتھ تھیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”سس..... ساتھ..... نہیں تو..... الگ تھیں..... الا قسم بالکل الگ۔“

”میں پوچھ رہا ہوں اس واقعے سے پہلے تم تینوں کہاں تھے۔“

”مم..... میں..... ایک بک اسٹال پر تھا اور وہ نہ جانے کہاں تھیں۔ میں نہیں جانتا۔“

”مجھ سے بھی جھوٹ بولو گے، حالانکہ میں تمہارے حق میں تمہارے باپ سے بھی زیادہ

خطرناک ثابت ہو سکتا ہوں۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔“

”پھر تم نے ایک بک اسٹال والے سے جھگڑا کیوں کیا تھا۔“

”اس نے بدتمیزی کی تھی۔“

”تم ان لڑکیوں کو نہیں جانتے۔“

”جی نہیں۔“

”پھر ان میں کیوں جا کودے تھے۔“

قاسم نے دانتوں میں انگلی دبائی اور شرمیلے انداز میں سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

”بولو.....!“ فریدی جھنجھلا گیا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”میں..... میں..... حمید بھائی کو بتا دوں گا۔“ قاسم نے شرمیلے انداز میں کہا۔

”ہاں..... حمید بھائی تمہاری سہیلی ہیں نا۔“ حمید بولا۔

”کیا.....؟“ قاسم آنکھیں پھاڑ کر حمید کی طرف پلٹا۔ ”کیا کہا تم نے سہیلی..... گویا میں

لوٹھایا ہوں۔ میرے ٹھیکے پہ گیا سالا تھانہ وانہ..... مت سفارش کرنا۔ پھانسی تھوڑا ہی ہو جائیگی۔“

”قاسم.....!“ فریدی کی آواز کمرے میں گونجی۔

”جی ہاں..... آپ اسے منع نہیں کرتے۔“

”میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے۔“

”پوچھئے۔“ قاسم کا موڈ بگڑ گیا۔ ”مجھے کسی کا ڈر نہیں پڑا ہے۔ میں نے ایک ناول میں

پڑھا تھا کہ محبت کرنا جرم نہیں ہے..... جی ہاں!“

”قاسم.....!“ دفعتاً فریدی نرم پڑ گیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ بتا دو۔ تم مرد

بچے ہو۔ جیل کی سختیاں برداشت کر لو گے۔ مگر وہ بچاریاں..... تمہیں ان پر ضرور رحم آنا چاہئے۔“

”پھر بتائیے میں کیا کروں۔“ قاسم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”کہاں وہ گرج رہا تھا اور

کہاں اب اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ذہنی رو بیکنے اور اس کے جسمانی ردعمل میں

دیر ہی نہیں لگتی تھی۔

”مجھے سب کچھ بتا دو۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”وہ تمہیں کب اور کہاں ملی تھیں۔“

تم انہیں کب سے جانتے ہو۔ اس واقعے سے پہلے تم تینوں کہاں تھے۔“

”وہ مجھے آج سے پندرہ دن پہلے ملی تھیں۔ میں انہیں پندرہ دن سے جانتا ہوں۔ ان

واقعات سے پہلے میں بکسٹال پر تھا اور وہ دونوں نہ جانے کہاں تھیں۔ الا قسم میں نہیں جانتا۔“

”اس سے پہلے تم تینوں کہاں ملتے رہے ہو۔“

”راجس اسٹریٹ کے موڑ پر..... پھر میں انہیں کالج پہنچا کر واپس ہو جایا کرتا تھا..... وہ

گانا ہے نا..... محبت اثر کرتی ہے، دھیرے دھیرے۔“

دفعتاً حمید نے فریدی سے کہا۔ ”آپ جانیے..... یہ معاملہ آپ کے بس کا نہیں ہے۔“

فریدی چند لمحے قاسم کو گھورتا رہا پھر کمرے سے چلا گیا۔

حمید نے قاسم کے بازو سہلانے شروع کر دیے اور قاسم اس طرح منہ پھیلائے کھڑا رہا

جیسے کوئی بدسلوک اور پھوہڑ بیوی اپنے فدوی قسم کے شوہر سے نخرے کرتی ہے۔

”یار تم بڑے خوش قسمت ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”تمہیں ویسی ہی لڑکیاں مل گئیں جیسی تم

چاہتے تھے۔ مگر تم دو یا کرو گے، ایک میری رہی کیوں؟“

”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ قاسم غرایا۔

”ان میں سے ایک کچھ دہلی ہے اور بیمار بھی معلوم ہوتی ہے۔“

”بکواس ہے، میں یقین نہیں کر سکتا۔ ہوگی بیمار..... تمہاری بلا سے۔ ایک بھی نہیں مل سکتی۔“

”پھر بھی دو کیا کرو گے۔“

”اپنی قبر میں لے جاؤں گا۔ تم سے مطلب.....!“

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”میں تمہاری بیوی اور باپ کو

فون کر کے یہیں بلوائے لیتا ہوں۔“

حمید دروازے کی طرف مڑا لیکن دوسرے ہی لمحے میں قاسم نے جھپٹ کر اسکی کمر پکڑ لی۔

”نہیں..... میں انہیں بلاؤں گا۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں گھپلا کرتے ہو یار..... حمید بھائی۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اچھا دہلی والی تم لے

لو..... الا قسم لے لو۔“

”مگر اس پر قبضہ کرنے سے پہلے میں یہ بھی معلوم کرنا چاہوں گا کہ ان دونوں نے تمہیں

کیوں بیٹنا شروع کر دیا تھا۔

”حمید بھائی یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔“ قاسم تشویش کن لہجے میں بولا۔ ”پہلے انہوں نے ہل چایا۔ اسی لئے ہل چایا کہ لوگ مجھے چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ پھر جب میں اُن شکر یہ ادا کرنے کے لئے قریب گیا تو وہ مجھ پر الٹ پڑیں۔“

حمید کچھ سوچنے لگا۔ پھر پوچھا۔ ”کیا اس سے پہلے بھی کبھی تم نے ان سے گفتگو کی تھی؟“
”میں چپکے چپکے محبت کر رہا تھا..... محبت ایسے ہی ہوتی ہے، حمید بھائی۔“
”میں کچھ نہیں سمجھا..... مجھے پورا واقعہ بتاؤ کہ تم نے اُن سے کس طرح محبت شروع کی تھی۔“ قاسم نے بڑی روانی کے ساتھ پندرہ روز کی رپورٹ دی۔

اور حمید بے ساختہ لاجول پڑھ کر اُسے برا بھلا کہنے لگا۔
”پھر کیا کرتا۔“ قاسم جھنجھلا کر بولا۔ ”کیا اُن کے گھر میں گھس جاتا۔“
”اُن کے گھر دیکھ لئے ہیں تم نے۔“
”نہیں..... کیا ضرورت تھی..... وہ کیا شعر ہے..... ترے نام پر مٹا ہوں، مجھے کیا غرض ہے جہاں سے۔“

”نشاں سے.....!“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔
”نہیں جہاں سے..... کیا تم مجھے جاہل سمجھتے ہو۔“ قاسم جھلا کر بولا۔
”ختم کرو..... میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“
”یعنی تم مجھے جیل جانے دو گے۔“

”نہیں میں تمہیں پھانسی دلوا کر تمہاری بیوی سے عقد کر لوں گا۔“
”کیا..... ذرا زبان سنبھال کر۔“ قاسم چنگھاڑا۔ ”گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔“
حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی کمرے میں داخل ہوا۔ ”تم دونوں باہر جاؤ اور ان میں سے ایک لڑکی کو یہاں بھیج دو۔“

”یہ کچھ بھی نہیں جانتا۔“ حمید نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”صرف ان دونوں کا تعاقب کیا کرتا تھا۔“

”اونہہ..... ختم کرو..... جاؤ۔“

حمید اور قاسم کمرے سے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکی آئی۔
”بیٹھ جاؤ.....!“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
لڑکی بیٹھ گئی۔ وہ بہت زیادہ خائف نظر آ رہی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی فریدی کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔
”تمہارا کیا نام ہے۔“ فریدی نے پوچھا لیکن لڑکی جواب دینے کی بجائے رونے لگی۔
اور پھر اُس نے بدقت کہا۔ ”ہمیں..... معاف..... کر دیجئے۔“
”ہاں..... ہو سکتا ہے کہ ہم تمہیں معاف کر دیں لیکن اُسی صورت میں جب ہمیں اس پاگل پن کی وجہ معلوم ہو جائے۔“

لڑکی سسکیاں لیتی رہی اور فریدی اس کے جواب کا منتظر رہا۔
اچانک ایک آدمی کمرے میں در آنہ گھستا چلا آیا۔ ادھیڑ عمر کا ایک صحت مند آدمی تھا۔ اُسے دیکھتے ہی لڑکی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر پھر سسکیاں لینے لگی۔

”میں اس طرح چلے آنے کی معافی چاہتا ہوں کر ٹل فریدی۔“ آنے والے نے کہا۔
”کوئی بات نہیں جناب..... فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ لیکن اُس کی عقابی آنکھیں بڑے معنی خیز انداز میں اُسکے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
آنے والا یہاں کا سٹی مجسٹریٹ تھا اور فریدی اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔

”میری بھانجی ہے۔“ آنے والے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”کیا آپ کو واقعات کا علم ہو چکا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔
”ہو چکا ہے..... کیا میں توقع کروں کہ آپ میری عزت کا پاس کریں گے۔“
”آپ کی عزت میری عزت ہے جناب۔“ فریدی نے خاکسارانہ لہجے میں کہا۔
”مگر آپ مجھے اس کی اجازت تو دے ہی دیں گے کہ میں اسکی وجہ دریافت کر سکوں۔“
”وجہ تو ڈاکٹر بھی نہیں دریافت کر سکے کر ٹل۔“ سٹی مجسٹریٹ نے کہا۔ ”ویسے اُن کا خیال

ہے کہ یہ کسی قسم کا دورہ ہے۔“

”لیکن ان دونوں پر بیک وقت ایک ہی قسم کا دورہ..... میں نہیں سمجھ سکتا۔“

”میں خود بھی الجھن میں ہوں۔“ سٹی مجسٹریٹ بولا۔ ”میں نے بھی یہی سنا تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں جی ہاں.....!“

”فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”اچھا..... وہ دوسری لڑکی کون ہے۔“

”اسی کی کلاس فیلو..... وہ بھی پڑوسی ہی ہے..... میں درخواست کروں گا کہ اس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیے۔“

”میں نے اب تک اس معاملے کو آگے نہیں بڑھایا۔ لیکن آپ خود سوچئے اس قسم کے واقعات جب اکٹھا ہو جائیں تو مجھ جیسے آدمی کو ضرور تشویش ہوگی۔“

”میں سمجھتا ہوں کرل..... مجھے علم ہے کہ شہر میں ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں۔“

”اچھا..... مجھے صرف یہی بتا دیں کہ انہوں نے کلاک ٹاور پر اپنا غصہ کیوں اتارا تھا۔“

”سارہ.....!“ دفعتاً سٹی مجسٹریٹ نے لڑکی کو مخاطب کیا لیکن اس کے ہاتھ بدستور چہرے ہی پر جمے رہے۔

”سارہ..... تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے..... بتاؤ۔“ سٹی مجسٹریٹ نے سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے نہیں معلوم..... میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے یاد نہیں۔“ وہ ہذیبانی انداز میں بولی۔

”تو تم میری بے عزتی کراؤ گی..... کیوں!“

لڑکی نے اور زیادہ تیزی سے رونا شروع کر دیا۔

”بہتر ہے آپ انہیں اس وقت گھر ہی لے جائیے۔“ فریدی بولا۔

”مگر اس دوسری لڑکی سے بھی تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”دونوں ساتھ ہی جائیگی۔“ سٹی مجسٹریٹ نے کہا۔ ”آپ کو جو کچھ پوچھا ہو پوچھ لیجئے۔“

”آپ کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ انہیں بھی لے جائیے۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی گھٹی بجائی۔

سٹی مجسٹریٹ لڑکی کو کرسی سے اٹھا کر باہر لے جانے لگا۔ گھٹی کی آواز پر ایک کانٹیل

اندر آیا۔ فریدی نے اس سے دوسری لڑکی کو لانا کو کہا۔

دوسری لڑکی اندر آئی، لیکن اب اس کے چہرے پر خوف و خجالت کی بجائے غصے کے آثار تھے۔ فریدی سمجھ گیا کہ سٹی مجسٹریٹ کا سہارا مل جانے کی وجہ سے اب کوئی نئی کروٹ لینے والی ہے۔ ویسے بھی صورت سے وہ کافی ذہین اور فتنہ پرداز معلوم ہوتی تھی۔

”بیٹھ جائیے۔“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ اس لفتے کو بچانا چاہتے ہیں، میں سمجھتی ہوں، مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ وہ آپ کی جان پہچان والا ہے۔“

”دوسری بات آپ نے غلط نہیں کہی..... لیکن پہلی بات میں سننے کے لئے تیار نہیں۔“

”وہ بہت دنوں سے ہمارا تعاقب کیا کرتا تھا۔ آج ہم نے پیٹ دیا اور یہ بالکل بکواس ہے کہ ہم نے کلاک ٹاور پر پتھر چلائے تھے۔ آپ اُسے بچانے کیلئے ہمارے خلاف کیس بنا رہے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ فریدی اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”لیکن کچھ دیر قبل آپ لوگ معافی کس بات کی مانگ رہی تھیں۔ روٹی کیوں تھیں؟“

”یہ بھی سراسر جھوٹ ہے..... بکواس ہے۔“

”میں ہار گیا بھی۔“ فریدی ہنسنے لگا۔ ”تم جاسکتی ہو۔“

”یوں نہیں..... اس موٹے کے خلاف ہماری رپورٹ درج کی جائے۔“

”اچھا.....!“ فریدی جیب سے فاؤنٹین پن نکالتا ہوا بولا۔ ”بولو..... کیا لکھوں۔“ اس نے اپنی نوٹ بک کھول لی تھی۔

”میں تھانے کے روزنامے پر رپورٹ چاہتی ہوں مسٹر۔“

”اچھا..... اچھا..... لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں نگے پیر کیوں ہو..... وہ تمہارے سینڈل بھی ہضم کر گیا۔“

لڑکی شپٹا گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی بولی۔ ”ہم نے سینڈلوں سے اس کی مرمت کی تھی۔“

”ہاں! ہو سکتا ہے لیکن کسی کو پینے کے لئے صرف ایک ہی جوتا اتارا جاتا ہے، دونوں نہیں۔ کیونکہ ایک ہاتھ اپنے بچاؤ کے لئے بھی خالی رکھا جاتا ہے۔ کیوں.....؟“

اس نے فوراً ہی جواب دینے کی کوشش نہیں کی اور فریدی اُسے بولنے کا موقع دیے بغیر

بولاً۔ ”دفع ہو جاؤ..... لیکن یہ نہ سمجھنا کہ قانون کی آنکھیں بند ہیں۔ تم شوق سے اس خلاف رپورٹ درج کرادو، لیکن خود مجسٹریٹ صاحب کا کہنا ہے کہ تم دونوں کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو۔“

”غلط.....!“

”قطعی غلط ہے..... حقیقت کیا ہے، اسے دریافت کرنا میرا کام ہے..... جاؤ۔“

وہ فریدی کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہاں سے اٹھ گئی اور فریدی بھی اُس کے ساتھ بھاگا۔ وہ اس کمرے میں آئے جہاں سائرہ اور سٹی مجسٹریٹ، قاسم اور حمید سمیت موجود تھے۔ سائرہ کی ساتھی نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر خاموش ہی رہ گئی۔

”آپ اگر کچھ دیر ٹھہریں تو میں مشکور ہوں گا۔“ فریدی نے مجسٹریٹ سے کہا۔
”ضرور..... ضرور.....!“

”انہیں آپ گھر جانے دیں۔“ وہ لڑکیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”نہیں..... میں انہیں ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“

”اچھا تو پھر..... ہمیں کہیں..... معاف کیجئے گا..... میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں اگر آپ پھر اسی کمرے تک چل سکیں تو.....!“

”اوہ..... ہاں..... ہاں.....!“ مجسٹریٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آئے جہاں کچھ دیر قبل دونوں میں گفتگو ہو چکی تھی۔ مجسٹریٹ کے چہرے پر الجھن اور شرمندگی کے آثار تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ جلد سے جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہو۔

فریدی چند لمحے اُسی کے بولنے کا منتظر رہا لیکن مجسٹریٹ کی آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ آخر فریدی نے پوچھا۔ ”کیا گھر پر بھی کبھی اس قسم کا دورہ پڑنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔“

”جی ہاں..... صرف ایک بار۔ شاید پچھلے ہی ہفتہ کی بات ہے۔“

”کیا آپ مجھے اُس کے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ مجسٹریٹ نے مضطرب آواز میں کہا۔ ”اُس نے اپنے ایک بزرگ پر

جس کا وہ بہت زیادہ احترام کرتی ہے کتابیں سمجھنے ماری تھیں۔ پھر چھری لے کر دوڑی تھی۔ اُن سے صرف اتنی غلطی سرزد ہوئی تھی کہ وہ اُسکی اجازت حاصل کئے بغیر اسکے کمرے میں چلے گئے تھے۔“
”اوہو..... او.....!“ فریدی نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا۔

”وہ چھری لے کر دوڑی۔ لیکن ان کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ایک بیک ہوش میں آ گئی ہو۔“

”یعنی اُس نے چھری پھینک دی ہوگی۔“ فریدی بولا۔

”جی ہاں..... چند لمحے کھڑی حیران حیران چاروں طرف دیکھتی رہی پھر اُن کے قدموں پر گر کر رونا شروع کر دیا۔“

”ہوں.....!“ فریدی صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”اچھا..... اُس دوسری لڑکی کے متعلق بھی کچھ معلوم ہو سکے گا۔“

”نہیں..... اسکے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔“ مجسٹریٹ نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

فریدی سمجھ گیا کہ وہ اس کے استفسارات کو لغو اور غیر ضروری سمجھ رہا ہے لہذا اُس نے کہا۔ ”میں اُسے کسی قسم کا مرض سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ شہر میں اب تک اس قسم کی تین یا چالیس وارداتیں ہو چکی ہیں۔ پچھلے ہفتے ایک لڑکی نے ایک دوکاندار کو چاقو مار دیا تھا آپ خود سوچئے۔ کیا پہلے بھی کبھی اس قسم کی وارداتیں ہوئی ہیں اور دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ مرض ابھی تک نچلے طبقے کی عورتوں یا لڑکیوں میں نہیں پایا گیا۔ میں اس سلسلے میں شہر کے بہترین ڈاکٹروں سے بھی گفتگو کر چکا ہوں۔ وہ اس قسم کے مرض کے وجود سے انکار کرتے ہیں جس کا حملہ چشم زدن میں ہو کر سائے کی طرح گزر جاتا ہو۔ اب تک کی رپورٹ یہ ہے کہ ایسی کیفیت کسی بھی لڑکی پر دو منٹ سے زیادہ طاری نہیں رہی۔ بعض حالات میں یہ وقفہ آدھے منٹ سے بھی کم کا پایا گیا ہے۔ کئی لڑکیوں کا طبی معائنہ بھی کیا گیا لیکن کسی ذہنی مرض کی علامات اُن میں نہیں پائی گئیں۔“

مجسٹریٹ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ فریدی کے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا۔

”پھر آخر یہ سب کیا ہے۔ اب تک کئی ڈاکٹر سائرہ کو دیکھ چکے ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال

”الاقسم..... اچھا نہیں ہوگا۔“

”تم شاید ذلیل ہی جانا چاہتے ہو۔“

”میں جہنم میں جانا چاہتا ہوں۔ تمہاری بلا سے۔“

”تم نے اُن کے ہاتھوں سے سینڈل کھائے تھے۔ تمہیں ڈوب کر مرنا چاہیے۔“

قاسم چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”زور سے ایک بھی نہیں پڑی تھی..... الا قسم.....!“

”اچھا تو پھر ایک کام کرو.....!“

”کیا.....!“

”اب زور سے ایک مجھ سے کھالو۔ میں اُن لڑکیوں سے دستبردار ہو جاؤں گا۔“

”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ قاسم نے منہ پھلایا۔

”ذیلی والی کا نام سارہ ہے۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں شاعرہ ہوگا۔“ قاسم نے قابلیت کا اظہار کیا۔

”کیوں.....؟“

”تلخ یہی ہے۔“ قاسم نے عالمانہ شان سے کہا۔ ”جاہل اور بے پڑھے لوگ سارہ کہتے ہیں۔“

حمید ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”تلخ کے بچے..... نگڑی والی کا نام روجی ہے۔ شاید میں اُسے کل

ہی شام کو سیر کے لئے باہر لے جاؤں۔“

”جہاں دیکھ لیا..... دونوں کو قتل کر دوں گا۔“ قاسم غریبا۔

ایک ایک جگہ حمید نے کارروک دی اور قاسم کا شاہتھپکا ہوا بولا۔

”جاؤ..... انہیں راجرس اسٹریٹ میں تلاش کرو..... میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔“

”میں پہلے ہی جانتا تھا۔“ قاسم ہنسنے لگا۔ لیکن اس کی نظر غیر ارادی طور پر ادھر ہی اٹھ گئی

جدھر حمید دیکھ رہا تھا۔

اُسے جوتوں کی دوکان میں وہی آدمی نظر آیا، جو لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ پھر

قاسم نے اُن دونوں لڑکیوں کو بھی ڈھونڈ ہی نکالا۔ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کار میں بیٹھی

ہوئی تھیں۔

قاسم دوسرے ہی لمحے میں حمید کا شانہ دبوچ کر بولا۔ ”کیوں.....؟“

”ہاں..... اب تم جاؤ ورنہ تمہارے ابا خفا ہوں گے۔“ حمید ہمدردانہ لہجے میں بولا۔

”حمید بھائی..... میں بالکل مروت نہیں کروں گا۔“

”تم جاتے ہو یا میں کسی ڈیوٹی کا فیسبل کو بلا کر تمہیں پھر تھانے بھجوا دوں۔“

”اماں جاؤ..... مر گئے بھجوانے والے..... ہاں..... گویا میں بالکل گدھا ہوں۔ دیکھوں

تو کیسے بھجواتے ہو۔ میں تو اس وقت اُن بیچاروں کو بچانا چاہتا تھا۔“

”تم بچا چکے نا.....!“

”ہاں..... ہاں..... اب اُن کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔“

”اچھا تو بس اب جاؤ۔“

”نہیں جانا..... تمہارے باپ کی سڑک ہے۔“ قاسم بچوں کی طرح الجھ پڑا۔

”قاسم کیوں شامت آئی ہے۔“

”کیا کرو گے تم میرا..... کوئی میں تمہاری سفارش پر چھوٹا ہوں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ پھر لڑکیوں کی کار کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مجسٹریٹ شاید چیلوں کے دو

جوڑے لے کر واپس آیا تھا۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لڑکیاں پچھلی سیٹ پر تھیں۔ حمید نے روجی کو

کار سے اترتے دیکھا۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر چڑھ گئی۔ مجسٹریٹ کی کار آگے جا چکی تھی۔ حمید نے

بڑی تیزی سے سڑک پار کی اور قاسم کار ہی میں بیٹھنا نہ پھاڑے ہوئے اُسے گھورتا رہا۔

”ذرا ٹھہریے.....!“ حمید روجی کے قریب پہنچ کر بولا۔ وہ رک کر اُس کی طرف مڑی۔

”اوہ..... ہاں..... کیا بات ہے۔“

”اب مجھے یقین آ گیا ہے۔“ حمید نے آہستہ سے کہا اور روجی اُسے گھورتی رہی اور حمید

پھر بولا۔ ”وہ درحقیقت لفظ ہے۔ اُس نے یقیناً آپ سے بدتمیزی کی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ

آپ پھر اُس کی تھوڑی سی مرمت کر دیں۔“

”کیوں.....!“ روجی پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

”بس یونہی..... ورنہ آپ کو بدنام کرتا پھرے گا۔“
”میں نہیں سمجھی۔“

”ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ..... آپ.....!“
”ہاں..... ہاں..... کہئے۔“

”مجھے شرم آتی ہے۔“ حمید نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”کہئے بھی تو..... پھر میں دیکھوں گی کہ آپ کی شرم ضروری تھی یا غیر ضروری۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ آپ اس پر عاشق ہو گئی ہیں اور دیکھئے نا اب بھی اُس نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ادھر دیکھئے..... کار میں بیٹھا ہوا ہے۔“

”اوہ..... اچھا.....!“ روجی بڑا سامنے بنا کر بولی۔ ”تھہریئے! میں اسے اپنی محبت کا یقین دلائے دیتی ہوں۔ چلیں نئی ہیں اور کافی مضبوط بھی۔“

وہ فٹ پاتھ سے اتر کر قاسم کی طرف بڑھنے لگی۔ قاسم نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔
تو رکھ کچھ اچھے نظر نہیں آئے اور اس نے حمید کو اس سے باتیں کرتے بھی دیکھا تھا۔ اس لئے اس کی اوندھی کھوپڑی میں بھی یہ بات آگئی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ سا ہے۔

دوسرے ہی لمحے میں اس نے کار اسٹارٹ کی اور مڑ کر دیکھ بغیر اڑتا چلا گیا۔ روجی کو آدھے ہی راستے سے واپس ہونا پڑا۔ حمید اب بھی وہیں کھڑا تھا۔

وہ اس کے قریب پہنچ کر بولی۔ ”مائی ڈیئر مسٹر سراغ رساں۔ اب گھر واپس جاؤ۔ شام ہو رہی ہے ورنہ اماں ماریں گی سمجھ! جاؤ میرے ننھے بچے۔“

حمید سناٹے میں آ گیا۔ وہ اُسے اتنی فارورڈ نہیں سمجھتا تھا۔

”نائیں.....! اماں بی نے کہا تھا اکیلے گھر مت آنا۔“ حمید نے بچوں کے سے لہجے میں کہا۔ ”تم پانچ بھائی بھی نہیں جو مجھے کہنا پڑے کہ پانچوں آپس میں بانٹ لو۔“

”میں تمہارے لئے مہا بھارت ہی ثابت ہوں گی۔ اسے یاد رکھنا..... اب جاؤ..... میں پہلے بھی کیپٹن حمید کی بہتری تعریفیں سن چکی ہوں۔ لیکن میں دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہوں۔ اگر تم مجھے زیادہ پسند آئے تو میں تمہیں متکلی بھی کر سکتی ہوں۔ میں عورت نہیں مرد ہوں سمجھ۔“

”اسی لئے تمہانہ میں رو پڑی تھیں۔“

”کیا تم اپنی بے بسی پر کبھی نہیں روئے۔“

”ہاں رویا ہوں..... مگر انہیں مواقع پر جب بہت دنوں سے کوئی لڑکی نہیں ملی۔“

”تم کیا چاہتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں..... تم جیسی واہیات لڑکیوں سے بھلا میں کیا چاہوں گا۔“

”میں واہیات ہوں.....!“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”واہیات سے بھی بدتر.....!“

”تو پھر تم بھی کچھ دیکھنا چاہتے ہو۔“

”ہاں! مگر وہ تمہاری صورت کے علاوہ تو بہتر ہے۔“

”اچھا اگر بڑے بہادر ہو تو آؤ میرے ساتھ۔“ روجی نے اُسے چیلنج کیا اور حمید سوچ میں

پڑ گیا کہ اُسے عورتوں کے کس ریوڑ میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ ابھی تو وہ اپنی نوعیت کی ایک ہی ثابت ہوئی تھی۔

”چلو..... میں تیار ہوں۔“ حمید بولا۔

”تم مجھے نہیں جانتے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں کلاک ٹاور کی گھڑی توڑنا چاہتی

تھی۔ تم سوال کرو گے کیوں؟ وہ بھی سن لو۔ میں چاہتی تھی کہ دس بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ

جاؤں جہاں جانا تھا لیکن کلاک ٹاور نے دس بجادیئے اور مجھے گھڑی پر غصہ آ گیا۔ میں کچھ اسی

قسم کی کرکے ہوں سمجھ۔“

”آہ..... خوب..... مانتا ہوں۔“ حمید نے سر ہلا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”اس پر مجھے اپنے

غصے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ مگر چلو کہیں اطمینان سے بیٹھ کر۔“

”یہ بھی ممکن ہے..... میں تم سے خائف نہیں ہوں۔“

”روجی صاحبہ.....!“ حمید نے آگے بڑھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔ ”اگر لڑکیاں

مجھ سے خائف ہوتیں تو آپ تک میری شہرت کا افسانہ کیسے پہنچتا۔“

حمید ایک قریبی رستوران میں داخل ہو گیا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب

کر رہا ہے۔ روجی اس کے پیچھے تھی۔ وہ ایک خالی کیمین میں جا بیٹھے اور حمید کہنے لگا۔
 ”کسی گھڑی پر دو چار منٹ تک غصہ اتار دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک بار
 ساری رات ایک گدھے پر غصہ اتارا تھا۔ گدھے سے مراد آدمی نہیں ہے، جیسے کسی مخصوص قسم
 کے آدمی کو لوگ گدھا کہہ دیتے ہیں۔ بلکہ سچ گچ کا گدھا..... ہاں تو اتفاقاً ایک بار مجھے ایک
 ایسے مکان میں قیام کرنا پڑا جس سے ملا ہوا کسی دھوبی کا گھر تھا۔ رات میں اُس کے گدھے
 نے پینکنا شروع کیا۔ میری نیند اچھی اور مجھے غصہ آ گیا۔ بھلا گدھے سے آدمیوں کی سی باتیں کیا
 کرتا۔ اسی کی زبان میں اُسے سلواتیں سنائی شروع کر دیں۔ دو چار بار اُسے چیلنج بھی کیا کہ نکل
 آئے میدان میں..... نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پڑوسی نے میرے میزبان کے دروازے پر دستک
 دے کر کہا۔ ”اگر تم مجھے ضد دلاؤ گے تو میں بھی ایک پال لوں گا۔“
 روجی ہنسنے لگی اور حمید نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال میں غصے میں
 رات بھر پینکنا رہا تھا۔ کسی گھڑی پر غصہ اتار دینا میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا..... کیا سمجھیں۔“
 ”میں کچھ نہیں سمجھی..... تم میرے پیچھے کیوں لگے ہو۔“
 ”مقدرات..... جنہیں کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میں
 نے سوچا تھا کہ اس سال شادی کر ڈالوں گا مگر اب دس سال تک کوئی امید نہیں۔“
 ”کیوں.....؟“
 ”ہلو..... روجی.....!“ اچانک کسی نے کیمین کے باہر سے روجی کو مخاطب کیا..... حمید اوٹ
 میں تھا۔
 ”آؤ..... آؤ..... چلے آؤ.....!“ روجی کھل اٹھی۔
 حمید نے میز پر جھکتے ہوئے باہر دیکھا۔ اُسے وہی نوجوان نظر آیا جو کافی دیر سے اُن
 دونوں کے پیچھے لگا رہا تھا۔ یہ کافی قبول صورت اور پرکشش تھا۔ حمید محسوس کر رہا تھا کہ لڑکیاں
 اسے ضرور پسند کرتی ہوں گی۔
 وہ کیمین میں آ گیا..... لیکن حمید کو دیکھ کر اس طرح ٹھٹھا جیسے اب تک وہ روجی کو وہاں تنہا
 تصور کرتا رہا۔

”کیا میں غل ہوا ہوں۔“ اُس نے خفیف ہونے کی شاعرانہ ایکٹنگ کی۔
 ”نہیں جناب..... قطعی نہیں! تشریف رکھئے۔“ حمید نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔
 ”آپ سے ملنے.....!“ روجی بولی۔ ”آپ محکمہ سرانغ رسانی کے آفیسر کیپٹن حمید ہیں۔“
 ”اوہ..... اچھا بڑی.....!“
 ”ظاہر ہے کہ آپ کو خوشی ہوگی۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کیا رکھا ہے ان رسی باتوں
 میں۔ میں تو آپ سے ہرگز آپ کا نام نہیں پوچھوں گا۔“
 آنے والا کچھ جھینپا جھینپا سا نظر آنے لگا کیونکہ اُس نے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا تھا
 لیکن روجی پر اس کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بدستور شرارت آمیز انداز میں مسکراتی رہی۔
 ”میرے بہتیرے ایسے احباب ہیں جن کے ناموں سے میں واقف نہیں ہوں۔“ حمید
 بولا۔ ”میرے لئے یہی بہتر بھی ہوتا ہے کہ مجھے لوگوں کے نام نہ معلوم ہوں، ورنہ میری راتوں
 کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر اس کا نام تفضل حسین ہے تو اس کے باپ
 کا کیا نام ہوگا۔ کیا تحمل ہوگا کیونکہ تفضل کا قافیہ تحمل ہی ہو سکتا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ تحمل
 ہوگا۔ خیر چلئے۔ دل کو تھوڑی سی تسکین ملی اور نیند آ گئی۔ دوسرے دن میاں تفضل حسین سے
 پوچھا بھی تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔ بڑی سعادتمندی سے بولے محمد حیدر بخش..... سکر میرا
 پر چکر اگیا۔ پھر بوکھلا کر دادا کا نام پوچھا جواب ملا محمد علی اور میں اپنا سر پیٹ کر خاموش ہو گیا۔
 پھر پردادا کا نام پوچھنے کی ہمت نہیں پڑی کہ ممکن ہے کہ اسے سن کر اس سے زیادہ مایوسی ہو۔“
 ”مایوسی..... بھلا مایوسی کیوں.....!“ روجی ہنسنے لگی۔
 ”کیوں..... آپ مایوسی کہتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض لمحات ایسے بھی گزرے ہیں کہ
 میں خودکشی کے امکانات پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ آپ خود سوچئے اس تجربے کے بعد
 میری راتیں کیسی گذری ہوں گی۔ مثلاً کسی تہور علی سے ملاقات ہوئی۔ جلدی میں ان کے باپ
 کا نام پوچھنا بھول گیا اور رات قیامت بن کر آئی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ ان کے باپ کا نام
 تصور علی ہو سکتا ہے کیونکہ قافیہ بھی ہے لیکن پھر خیال آیا کہ جب تفضل حسین کے باپ کا نام محمد
 حیدر بخش ہو سکتا ہے تو تہور علی کے باپ کا نام شیخ سلار کیوں نہ ہوگا۔ بس اختلاج شروع

ہو گیا۔ تصور علی اور شیخ سلار میں ٹھن گئی۔ خدا محفوظ رکھے، ساری رات جاگ کر گزار دی۔
 ”اب آپ خواہ مخواہ میرا وقت برباد کر رہے ہیں۔ آپ باتیں بڑی اچھی کر لیتے ہیں مگر..... مجھے جلدی ہے۔ اچھا پھر کبھی ملاقات ہوگی۔“ روجی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھ دیا۔ حمید نے اُس سے ہاتھ ملاتے وقت ایک طویل سانس لی اور فیصلی آنکھیں بنا کر سننے والے کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بھی روجی کے ساتھ ہی اٹھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ ”مجھے ایاز کہتے ہیں۔“
 حمید نے پہلے تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں پھر براسا منہ بنا کر بڑبڑایا۔
 ”اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو سن ہی لیا۔ خدا کے لئے اب اپنے والد کا نام بھی بتانے جایئے ورنہ زندگی مجھ پر حرام ہو جائے گی۔“
 ”باپ کا نام تو ہرگز نہ بتاؤں گا.....!“
 ”چلو.....!“ روجی اُسے دھکیلتی ہوئی بولی اور وہ دونوں کیمین سے باہر چلے گئے۔

حمید نے اس لڑکی کے متعلق یہی رائے قائم کی تھی کہ وہ صرف موڈی ہے۔ فطرتاً لائق نہیں ہے کہ ہر ایک سے بے تکلف ہو جائے بلکہ زبردستی ایسا کرتی ہے۔
 لیکن یہ سب کچھ تھا کیا؟ وہ کافی عرصے سے فریدی کو ایسی لڑکیوں کے چکر میں دیکھ رہا تھا..... حمید کا خیال تھا کہ لڑکیوں میں وقتی طور پر پیدا ہو جانے والا وحشیانہ پن کسی ذہنی مرض ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے لیکن وہ فریدی سے اس بات پر نہیں الجھا تھا۔ الجھتا بھی کیوں جبکہ اسی بہانے بھانت بھانت کی لڑکیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ ویسے فریدی نے آج پہلے پہل خصوصیت سے اُسے کسی لڑکی پر نظر رکھنے کو کہا تھا۔

فریدی اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے۔ اس کا علم اُسے نہیں تھا اور نہ اُس نے معلوم کرنے کی کوشش ہی کی تھی۔ وہ کافی دیر تک رستوران میں بیٹھا رہا۔ پھر جیسے ہی کلاک نے چار بجائے وہ اٹھ گیا۔

آج کل وہ مستقل طور پر ایکٹسٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ وجہ خود اُسے بھی نہیں معلوم تھی۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ کبھی کبھی سوچتا کہ اُسے اپنے ذہن پر بوریت کی گردن

بٹینے دینا چاہئے۔ کوشش کرتا کہ اضمحلال کو پاس بھی نہ بھٹکنے دے اسلئے زبردستی اپنے ساتھیوں کو پھینچ کر قہقہے لگاتا۔ خوب چپکٹا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ تو بڑی بور قسم کی باتیں ہیں۔ مثلاً ابھی کچھ ہی دیر پہلے اُس نے روجی کی موجودگی میں چپکے کی کوشش کی تھی اور اب محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے بہت ہی گھٹیا قسم کی باتیں کی ہوں۔ کسی تھرڈ کلاس مسٹرے کی طرح دوسروں کو زبردستی ہنسانے کی کوشش کرتا رہا ہو۔

”پھر اس بے نام سی اداسی کو کہاں دفن کروں۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑاتا ہوا اٹھ گیا۔
 لڑکیاں بھی اب اُسے کھلنے لگی تھیں۔ ویسے عادتاً وہ انہیں دیکھ کر بے چین ضرور ہو جاتا تھا لیکن جب کسی سے گفتگو شروع ہو جاتی تو تھوڑی ہی دیر بعد اُسے وحشت سی ہونے لگتی۔
 وہ رستوران سے باہر نکل کر بڑی دیر تک ادھر ادھر پھرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کہاں جائے۔ پھر اور سینٹ کی دیواریں اُسے کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔ وہ کھلی ہوا چاہتا تھا۔

وہ ذرا ہی دیر میں روجی اور اس کے ساتھی کے متعلق سب کچھ بھول گیا حالانکہ اُسے ہر حال میں اُن دونوں پر نظر رکھنی چاہئے تھی۔ ایاز اس نے اپنا نام بتایا تھا۔ پتہ نہیں وہ بھی حقیقت تھی یا جھوٹ۔ آدمی مکار قسم کا معلوم ہوا تھا اور پھر اُس کا رویہ بھی مشتبہ تھا۔ حمید نے اُسے اپنا اور روجی کا تعاقب کرتے دیکھا تھا اور پھر اس طرح اُن سے ملا تھا جیسے اُسے کیمین میں حمید کی موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔

مگر حمید کی اداسی تجسس کی جبلت پر غالب آگئی تھی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس آدمی کی اصلیت کا پتہ لگائے بغیر نچلا نہ بیٹھتا۔

وہ ایک فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ کہاں جائے۔ اچانک اُسے نیا گرہ ہوٹل کا خیال آیا جو شہر سے باہر ایک پُر فضا مقام پر واقع تھا اور آج کل گرمیوں کے موسم میں وہاں کی راتیں بڑی خوشگوار ہوا کرتی تھیں۔

وہاں آج کل کھلے آسمان کے نیچے رقص ہوتا تھا اور رقص گاہ کے گرد پھولدار جھاڑیوں میں رنگ برنگ کے قہقہے جگمگایا کرتے تھے۔ موسیقی کی لہریں دور تک سنائے میں منتشر ہو کر بڑی

خوشگوار بازگشت پیدا کرتیں۔

اس نے سوچا کہ اگر وہ کوشش کرے تو یہ رات بڑی خوشگوار ثابت ہو سکتی ہے مگر نیا
میں رات گزارنے کے لئے ایونک سوٹ ضروری تھا اور ایونک سوٹ کے لئے اسے گھر پر
ضرور جانا پڑتا لیکن گھر پہنچنے پر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نیا گرہ تک جاسی نہ سکا۔

اس کا دل چاہا کہ کسی دیوار سے ٹکرا کر ہمیشہ کے لئے قصہ ہی ختم کر دے۔ اسے
بیک فریدی پر غصہ آ گیا جو اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”آج میں ضرور پیوؤں گا۔“ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بڑبڑایا۔ ”مجھے شرافت
انسانیت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

اس نے بڑی تیزی سے سڑک پار کی اور اب وہ ٹیکسیوں کے اڈے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک تھی۔
لیکن اس کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ ایک ڈبلا پتلا چینی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جب
کبھی بے خبر ہو کر راہ نہیں چلتا تھا لیکن اس وقت اس کی ذہنی حالت اعتدال پر نہیں تھی۔

اس نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور سے کاسینو بار چلنے کو کہتا ہوا کھجلی نشست پر بیٹھ گیا۔
تعاقب کرنے والا چینی دوسری ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

بار میں ہنگامہ

قاسم غصے میں پاگل ہو رہا تھا اسے یقین تھا کہ حمید نے رومی کو اس کے خلاف ورغلا یا تھا
اور وہ کسی بُرے ہی ارادے کے تحت اس کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے کنکسن کے چوراہے کے
قریب اپنی بیوک روک دی اور وہیں حمید کا منتظر رہا۔ وہاں اس لئے رکا تھا کہ حمید خواہ راجرس
اسٹریٹ جائے یا اپنے گھر کی طرف اسے کنکسن کے چوراہے سے ضرور گزرنے پڑے گا۔

قاسم تقریباً تین گھنٹے تک رکا رہا۔ اس نے اپنی گاڑی سڑک کے نیچے اتار کر کھڑی کر دی
اور سڑک سے گزرنے والی ہر کار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے لگا تھا۔

تقریباً پانچ بجے حمید اسے ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔

”مظہر تو جانا دغا باز.....!“ اس نے دھاڑ کر اپنی کار اشارت کر دی اور پھر اتنی جلدی
اے سڑک پر لایا کہ وہ ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ دونوں نے بریک لگائے اور کاروں
کے اگلے حصوں میں صرف ایک فٹ یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

”اندھا.....!“ دوسری کار کا ڈرائیور کھڑکی سے سر نکال کر چیخا۔
”بیچھے ہٹاؤ.....!“ قاسم دھاڑا۔

اور جیسے ہی دوسری کار کے ڈرائیور نے اسے غور سے دیکھا اس کی روح فنا ہو گئی۔ شہر میں
قاسم کے باپ کی تقریباً چار درجن ٹیکسیاں چلتی تھیں اور یہ ٹیکسی بھی اتفاق سے انہیں میں سے

دوسرے ہی لمحے میں ڈرائیور اسے آندھی اور طوفان کی سی سرعت سے آگے نکال لے
گیا۔ ویسے یہ ضروری نہیں تھا کہ قاسم اپنے یہاں کام کرنے والے سینکڑوں آدمیوں میں سے

ہر ایک کو پہچانتا رہا ہو۔
اس نے بھی اپنی کار بڑھائی اور دل ہی دل میں حمید کو گالیاں دیتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ
مکن ہے رومی بھی اس کے ساتھ رہی ہو۔

وہ کار کی رفتار تیز کرتا رہا اور اس کار کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا جس سے ٹکر ہوتے
ہوتے بچی تھی۔
اس کے بعد جو کار دکھائی دی اس کے متعلق قاسم نے یہی اندازہ کیا کہ وہ ہو سکتی ہے
کیونکہ یہی راجرس اسٹریٹ کے سامنے سے گزری تھی۔

قاسم نے رفتار کچھ اور تیز کی اور ٹیکسی کے برابر پہنچ گیا حمید کھجلی سیٹ پر موجود تھا۔ ”قبر
تک پیچھا نہیں چھوڑوں گا..... سمجھے۔“ قاسم نے چیخ کر کہا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے پیارے.....!“ حمید چپک کر بولا۔ ”دیکھو آخر وہ خفا ہو گئی
نہ..... تم بھاگے کیوں تھے۔ وہ کہہ رہی تھی ایسے بیوقوفوں سے دور رہنا چاہئے۔“
”اب تم خود بیوقوف! اپنی گاڑی کو روکاؤ ورنہ لڑاؤں گا۔“

بڑی دیر تک ہونٹ بھیجنے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر ہنستا رہا۔

حمید نے اب کاسینو بار جانے اور شراب پینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

”قاسم.....!“ اُس نے تھوڑی دیر بعد اُسے مخاطب کیا۔

”آہ..... ہاں.....!“ قاسم چونک پڑا۔ وہ اپنے ہوائی قلعوں میں کھو گیا تھا۔

”اگر تم تھوڑی سی ہمت کر جاؤ تو کام بن سکتا ہے۔“

”کس طرح.....!“

”جس مرد کو بھی اس کے ساتھ دیکھو پیٹ دو۔“

”ارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ حمید بھائی۔ جب کہو تب۔ ابھی اگر کسی کو دکھا دو تو میں

ای وقت تمہیں اپنا کمال دکھا سکتا ہوں۔“

”نہیں ابھی صبر کرو۔“

”مگر یا حمید بھائی وہ کلاک ٹاور پر پتھراؤ کیوں کر رہی تھیں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ انہوں نے کلاک ٹاور ہی پر پتھراؤ کیا تھا۔“

”ارے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“ قاسم غصے سے کہہ رہا تھا۔

”بڑی شریر لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔“

”ہاں ہیں تو.....!“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر حمید نے کہا۔ ”ہم کیوں نہ راجرس اسٹریٹ ہی چلیں۔ مجھے

اس کا مکان معلوم ہے۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔“

”کبھی نہیں..... حمید بھائی..... میں بہت بد قسمت آدمی ہوں۔“ قاسم نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”دل نہ تھوڑا کرو۔“ حمید نے اُسے تسلی دی۔ ”اُسے فضل کرتے دیر نہیں لگتی یار!“

”میں تو سوچتا ہوں کہ اب مر ہی جاؤں۔“

”ہرگز نہیں۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”ایسا نہ کرنا۔ نہیں تو تمہاری بیوی کو بڑی خوشی ہوگی۔“

”ہائیں..... تم نے پھر اس کا تذکرہ چھیڑا۔“ قاسم نے غصیلی آواز میں کہا۔

حمید آہستہ آہستہ پھر بوریت محسوس کرنے لگا تھا لہذا اُس نے تیسری بار اپنا ارادہ بدل

حمید نے ڈرائیور سے رکنے کو کہا۔ اُس کے ذہن میں ایک نئی شرارت جنم لے رہی تھی۔
ٹیکسی رک گئی۔ دوسری طرف قاسم نے بھی کار روک دی تھی۔ اس طرح دونوں کاروں
نے سڑک کی پوری چوڑائی گھیر لی تھی۔ اس سلسلے میں انہیں پیچھے آنے والی کاروں سے بڑی
گندی گندی گالیاں سنائی دیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا کر سڑک کے
اتار دی۔ دوسری کاروں کو آگے بڑھنے کے لئے راستہ مل گیا۔ ان میں وہ کار بھی تھی جس پر
کاتاقب کرنے والا چینی بیٹھا ہوا تھا۔

حمید ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے قاسم کی کار کے قریب آیا۔

”کیا بات ہے۔“ اُس نے قاسم کی ٹھوڑی میں ہاتھ لگا کر کہا۔ قاسم نے کسی روٹی ہو

عورت کی طرح اُس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے اُلو نہیں بنا سکتے..... ہاں.....!“

”میں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی بلکہ تقریباً دو گھنٹے تک اُسے تمہاری خصوصیات

بتاتا رہا ہوں، مگر اُسے یقین نہیں آتا۔“

”کیا بتایا تھا تم نے۔“ قاسم نے اشتیاق ظاہر کیا۔

”یہی کہ شاید تم دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور آدمی ہو۔“

”ہاں..... ارے..... ہی ہی ہی..... میں کیا۔“

”واہ..... کیا میں نے غلط کہا تھا۔“ حمید نے انگلی نشست کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھے

ہوئے کہا۔ ”میں نے اُسے تمہارے درجنوں کارنامے سنائے۔“

”پھر اُس نے کیا کہا۔“ قاسم نے کار اشارت کرتے ہوئے پوچھا۔

”کہنے لگی اب میں قاسم صاحب کو بہت قریب سے دیکھوں گی۔“

”قاسم صاحب!..... کیا کہا تھا۔“ قاسم نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔

”دو ایک بار بے خودی میں قاسم پیارے بھی کہہ گئی تھی۔“

”ارے..... نہیں..... جھوٹ..... ہی ہی ہی۔“

”خیر آئندہ ملاقات ہونے پر تم خود ہی حقیقت معلوم کر لو گے۔“ حمید نے کہا اور قاسم

دیا۔ اب وہ راجس اسٹریٹ بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچا تھا کہ قاسم کو ایک بار پھر روٹی کے ہاتھوں پٹوادے گا۔ لیکن ان دنوں کسی ایک بات پر طبیعت جتنی ہی نہیں تھی۔ حمید کو شش کر کے اپنے ذہن کو کرید کرید کر اس بیزاری کی وجہ دریافت کر لے، مگر کامیابی نہ ہوتی۔

وہ سوچنے لگا کہ اب اُسے ان فتویات کو چھوڑ کر کوئی ٹھوس کام کرنا چاہئے۔ ممکن ہے اسی طرح بیزاری رفع ہو سکے۔ اُسے یاد آیا کہ فریدی ان دنوں اکثر سنگ سنگ بار کے چکر کا شکار ہے اور فریدی سے تصحیح اوقات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لہذا وہ کسی خاص ہم قسم کا چکر ہوگا۔

دھنسا اس نے قاسم سے کہا۔ ”مجھے بندرگاہ کے علاقے میں لے چلو۔“

”راجس اسٹریٹ نہیں۔“ قاسم بولا۔

”نہیں اس وقت مناسب نہیں ہے۔ اگر اس کے باپ سے مدد بھیڑ ہوگئی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”باپ ہے اُس کا؟“ قاسم نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بڑی مایوسی تھی۔

”نہ صرف باپ بلکہ دادا بھی۔ کبھی خان بہادر سجاد کا نام سنا ہے۔“

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔“

”روحی اُس کی لڑکی ہے۔“

”ہات تیری تقدیر کی.....!“ قاسم بسور کر بولا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کہنے لگا۔ ”نہیں حمید

بھائی۔ یہ گاڑی نہیں چلے گی۔ وہ والد صاحب کے دوستوں میں سے ہیں۔“

”تم جانو.....!“ حمید نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ دراصل اب اس موضوع کو ختم

ہی کر دینا چاہتا تھا۔

قاسم نے گریننگ روڈ پر کار موڑی اور اب وہ بندرگاہ کے علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ حمید سنگ سنگ بار تک جانا چاہتا تھا۔ یہ بندرگاہ ہی کے علاقے میں تھا اور وہاں کا اینگلو انڈین بارنڈر فریدی اور حمید سے اسی طرح واقف تھا جیسے دنیا کے سارے آدمی ملک الموت سے واقف ہیں۔

حمید نے سنگ سنگ بار سے کافی فاصلے پر کار روک لی اور نیچے اتر گیا۔

”میں بھی آؤں۔“ قاسم نے پوچھا۔

”نہیں..... اب تم جاؤ۔ میں یہاں ایک سرکاری کام سے آیا ہوں۔“

”اچھا اُس دوسری لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے۔“ قاسم نے آہستہ سے پوچھا۔

”اس سے کہوں گا کہ وہ تم سے محبت کرنے لگے۔ اب دفع ہو جاؤ۔“

حمید آگے ہڑھ گیا۔ لیکن قاسم کی کار جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

حمید پیدل ہی سنگ سنگ بار کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس بار کا مالک پی سنگ نامی ایک چینی تھا۔ کئی بار کا سزا یافتہ اور کافی بدنام بھی تھا۔

جیسے ہی حمید نے بار کے اندر قدم رکھا، مریل سے اینگلو انڈین بارنڈر نے اُسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر کاؤنٹر پر پھیلی ہوئی چیزوں کو رکھنا اٹھانا شروع کر دیا۔

لیکن حمید کاؤنٹر کی طرف نہیں گیا۔ چونکہ یہ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اس لئے یہاں زیادہ بھیڑ بھی نہیں تھی۔ کئی میزیں خالی نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ ویسے یہاں شام کو قتل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ حمید دروازے کے قریب کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ آج کل یہاں کاروبار ترقی پر معلوم ہوتا تھا کیونکہ ایک چھوڑ تین تین ویٹر نظر آ رہے تھے۔ ورنہ پہلے تو ایک ہی ویٹر ہوا کرتا تھا اور اکثر بارنڈر بھی ویٹر کا کام کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ دونوں نئے ویٹر چینی تھے۔ حمید چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نظریں بارنڈر کی نظروں سے ملیں اور بارنڈر نے سر جھکا لیا۔ حمید نے اُسے دونوں چینی ویٹروں کو کچھ اشارہ کرتے دیکھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس نے اشارہ ضرور کیا ہے۔ وہ اس کا واہمہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال دوسرے ہی لمحے میں اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہ دونوں چینی ویٹر صدر دروازے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ تیسرا پرانا ویٹر حمید کی طرف بڑھا۔

”آپ کے لئے کیا لاؤں۔“ اُس نے حمید سے پوچھا۔

”اور بیج اسکو آتش.....!“ حمید نے کہا۔

”نہیں ہے۔“

”کیوں! کون کرے گا جھگڑا۔“

”دیکھو! میں شروع کرتا ہوں۔“ حمید نے چاروں طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”تم کاؤنٹر کے پیچھے والے دروازے کو توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرنا۔ یہ جھین سرجنٹ ریش کی تھیں۔“

”جی پھر سنائی دی اور یک بیک حمید نے کھڑے ہو کر بارنڈر سے کہا۔“ یہ کون ہے! میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تم سے مطلب.....!“ ایک چینی غرا کر اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ ”چپ چاپ بیٹھو درنہ باہر چلے جاؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں حمید کا گھونہ اس کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ ایک میز سے ٹکرا کر میز سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ قاسم اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف جھپٹا اور ساتھ ہی سامنے آتی ہوئی ہر میز کو الٹا بھی گیا۔ اب دوسرے چینی نے حمید پر حملہ کیا لیکن اس کا گھونہ خلا میں ناچ کر رہ گیا۔ حمید بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چینی نے اس حملے پر اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی۔ لہذا وار خالی جانے پر وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ تیسرے ویٹر نے حمید پرسوڈے کی بوتل کھینچ ماری لیکن حمید غافل نہیں تھا۔ اس نے اُسے بھی خالی دیا اور وہ ایک گاہک کے سر پر پڑی۔

دوسری طرف قاسم نے بارنڈر کو اٹھا کر کاؤنٹر کے باہر پھینک دیا تھا اور اب دروازے پر ٹکریں مار رہا تھا۔ اُسے تو یہی محسوس ہوا جیسے وہ دروازہ توڑ کر اندر جا پڑا ہو۔ لیکن وہ محض اس کا خیال تھا۔ دروازے کے دونوں پت محفوظ تھے اور وہ خود پیٹ کے بل فرش پر پڑا ہوا دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ ہاتھی جیسا ڈیل ڈول..... اسے آسانی سے اٹھا کر سیدھا کھڑا کر دینا بہت مشکل تھا۔

بیک وقت پانچ آدمی قاسم پر ٹوٹ پڑے، جو اس بند کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ حمید نے وہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔

”اُسے ہٹالے جاؤ۔“ دفعتاً حمید نے پی سنگ کی آواز سنی اور ایک طرف سرجنٹ ریش کو

”تو پھر سادہ پانی میں برف ڈال لاؤ۔“

”گستاخی معاف! یہ بار ہے۔“ ویٹر بولا۔

دفعتاً حمید نے ایک چیخ سنی، جو کسی بند کمرے میں گونجی تھی۔ دوسرے لوگ بھی چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگے تھے۔

بارنڈر نے بلند اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے حضرات! ہمارا ایک ملازم جن کی پوری بوتل پڑا کر صاف کر گیا ہے۔ اسی کی مرمت ہو رہی ہے۔“

لوگ پھر اپنے گلاسوں اور بوتلوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حمید ایک بند دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آواز دراصل اسی کے پیچھے سے آئی تھی اور نہ جانے کیوں اُسے وہ آواز کچھ جانی پہچانی معلوم ہوئی تھی۔

”یہ سرکاری کام ہو رہا ہے۔“ اچانک اُس نے قاسم کی آواز سنی اور چونک کر مڑا۔ وہ اس پر جھکا ہوا مسکرا رہا تھا۔

”میں کرنل صاحب کو اس کی اطلاع ضرور دوں گا۔“ قاسم برا سامنے بنا کر بولا۔ ”بڑے پارسا بنتے ہیں۔“

”بیٹھو! بیٹھو!“ حمید نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

قاسم اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی پشت کاؤنٹر کی طرف تھی اور وہ بند دروازہ جس سے آواز آئی تھی کاؤنٹر کے پیچھے تھا۔ حمید جانتا تھا کہ پی سنگ اس کمرے کو اپنے آفس کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

”بچاؤ..... بچاؤ.....!“ جی پھر سنائی دی اور حمید اس بار بیساختہ اچھل پڑا۔ اب اس نے آواز پہچان لی تھی۔ یہ آواز فریدی کے دوسرے اسٹنٹ سرجنٹ ریش کی تھی۔ تیسری چیخ نے تو رہے سبے شبہات بھی زائل کر دیئے۔

”قاسم.....!“ حمید قاسم کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔ ”تم یہ چھین سن رہے ہو۔“

”ہاں..... سن رہا ہوں۔“

”یہاں جھگڑا بھی ہو سکتا ہے۔“

بیہوش پڑا دیکھا۔

اُس کمرے میں وہی پانچ آدمی تھے اور چھٹا خود پی سنگ تھا۔ حمید کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح قاسم کو اٹھنے میں مدد دے۔ قاسم طاقتور ضرور تھا لیکن اُس میں پھرتی نہیں تھی۔ ہوتی بھی کیسے..... کیونکہ وہ حد سے زیادہ جسم آدمی تھا۔

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ ورنہ گوئی مار دوں گا۔“ حمید نے پی سنگ کی آواز سنی اور اُسے دیکھا بھی۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کا رخ حمید کی طرف تھا۔ حمید نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ پانچوں آدمی بھی قاسم کو چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔ قاسم ہانپتا ہوا اٹھا اور پی سنگ کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اُس کے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ دھماکے والے اسلحہ سے بہت ڈرتا تھا۔ البتہ ہاتھ پیر کی لڑائی میں وہ شاید رستم سے بھی پیچھے نہ ہتا۔ اُس نے بھی ہانپتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

”اسے لے جاؤ۔“ پی سنگ نے بیہوش ریش کی طرف اشارہ کر کے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”گلی میں وین کھڑی ہے۔“

”پی سنگ کیوں شامت آئی ہے۔“ حمید نے اُسے للکارا۔

”شامت کا حال ابھی معلوم ہوگا۔ میں پی سنگ ہوں سمجھے۔ یہ ریش تو یہاں آیا ہی نہیں تھا اور تم دونوں میری سیکریٹری مس جوزف کو چھیڑ رہے تھے۔“

اُس نے مس جوزف کو آواز دی اور ساتھ ہی ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ وہ کاؤنٹر کی طرف کا دروازہ بند کر دے کیونکہ باہر سے بھی لوگ بار میں داخل ہونے لگے تھے۔

دروازہ بند کر دیا گیا اور ساتھ ہی ایک خوبصورت سی نو عمر اینگلو انڈین لڑکی داہنی طرف کے دروازے سے اندر آئی۔

”یہ دونوں تمہیں چھیڑ رہے تھے مس جوزف۔“

لڑکی نے انہیں نور سے دیکھا اور بولی۔ ”ہاں! انہوں نے مجھے زبردستی اٹھا لے جانے کی کوشش کی تھی۔“

”دیکھا تم نے۔“ پی سنگ نے حمید سے کہا۔

حمید اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے مس جوزف کو گھور رہا تھا۔ اتفاقاً مس جوزف کی نظریں پھر اس کی طرف اٹھ گئیں اور حمید نے بے تحاشہ اُسے آنکھ ماردی۔ لڑکی کے منہ سے جلیوں کا طوفان امنڈ پڑا۔ پی سنگ اس کی طرف دیکھنے لگا۔ حمید موقع کا منتظر ہی تھا۔ اُس نے اسی لئے اُسے آنکھ ماری تھی کہ موجودہ حالت میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو جائے۔ جیسے ہی پی سنگ کی نظر اس پر سے ہٹی اس نے پی سنگ پر چھلانگ لگا دی۔ پی سنگ دیوار سے جا ٹکرایا لیکن ریوالور حمید کے ہاتھ میں نہیں آسکا۔ وہ اب پی سنگ کے ہاتھ میں بھی نہیں تھا۔ حمید نے اس کی ناک پر ایک بھر پور ہاتھ رسید کر دیا۔ قاسم اُن لوگوں پر ٹوٹ پڑا تھا، جو ریش کو اٹھا کر وہاں سے لے جا رہے تھے۔

مس جوزف منتنائی ہوئی سارے کمرے میں ناچتی پھر رہی تھی۔ پی سنگ کمزور آدمی نہیں تھا..... ذرا ہی سی دیر میں بُری طرح ہانپنے لگا۔ وہ اُسے اپنے نیچے دبائے رکھنا چاہتا تھا..... دوسری طرف کاؤنٹر والا دروازہ بڑی شدت سے پٹا جا رہا تھا اور پھر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اُسے توڑ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

”دروازہ کھولو..... پولیس ہے۔“ کسی نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

پی سنگ کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ خائف ہو گیا ہے کیونکہ دوسرے ہی لمحے میں اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”ریش کو یہیں رہنے دو۔ مس جوزف ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ بس اب دروازہ کھول دو۔“

اس بدلتے ہوئے نقشے نے قاسم کے ہاتھ پیر روک دیے اور پی سنگ پھر بولا۔ ”دیکھو! ٹھہرو! تم پانچوں دوسری طرف سے گلی میں نکل جاؤ اور مس جوزف تم دروازہ کھول دینا۔ جلدی کرو۔ اپنا اسکرٹ دو چار جگہوں سے پھاڑ ڈالو۔“

”قاسم.....!“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”یہ پانچوں یہاں سے نکلنے نہ پائیں۔“

”ان کے باپ بھی نہیں نکل سکتے۔“ قاسم داہنی طرف کے دروازے پر جتا ہوا بولا۔

ایک بار پھر جدوجہد شروع ہو گئی لیکن دروازہ ٹوٹنے ہی والا تھا، مس جوزف اپنا اسکرٹ پھاڑ رہی تھی۔ اچانک دروازہ ٹوٹا اور آدمی اندر آ کرے، ان میں دو کانٹیل بھی تھے۔

”تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ اس کی شایان شان سلوک کیا جائے گا۔“

قاسم کی نظریں اس لڑکی پر تھیں اور وہ اپنے ہونٹ چاٹ رہا تھا۔

دفترِ رمیش نے کراہ کر روٹ بدلی اور حمید اس کی طرف جھپٹا۔ رمیش اٹھنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ حمید نے سہارا دے کر اُسے بٹھا دیا لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائے ہوئے تھا۔

”رمیش.....!“ حمید نے اُسے بلایا۔

رمیش نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔ وہ اتنی سرخ تھیں جیسے خون سے ڈوبی ہوئی

ہوں۔

”آپ انہیں سنبھالئے۔“ حمید نے سب انپکٹر سے کہا۔ ”میں رمیش کو لے جا رہا

ہوں۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ قاسم کی طرف مڑ کر بولا۔

”کیا تمہاری کار کہیں قریب ہی ہے۔“

”آں.....!“ قاسم چونک پڑا۔ وہ لڑکی کو گھورنے میں محو تھا اور کسی ایسی چمکاؤ کی طرح

پلکیں جھپکار رہا تھا جو اندھیرے سے اجالے میں پکڑ لائی گئی ہو۔

”اپنی گاڑی یہاں لاؤ۔“

”اچھا.....!“ قاسم نے بھاڑ سا منہ کھول کر کہا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے

دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

”ان میں سے ایک کو بھی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حمید رمیش کی بظلوں میں

ہاتھ دے کر اٹھاتا ہوا بولا۔

باہر قاسم کی کار موجود تھی۔ اس نے رمیش کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ رمیش ابھی تک کچھ بولا

نہیں تھا۔ لہذا یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ہوش ہی میں ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔

وہ سول ہسپتال میں آئے اور وہیں سے حمید نے فریدی کو بھی فون کیا لیکن وہ گھر پر موجود

نہیں تھا۔ دوسری جگہوں میں بھی جہاں اس کے ملنے کے امکانات تھے پوچھ گچھ کی گئی.....

فریدی کہیں بھی نہ مل سکا۔

پھر آٹھ دس کانٹیل اندر گھس آئے ان میں ایک سب انپکٹر بھی تھا۔

”ارے آپ.....!“ اُس نے حمید کو دیکھ کر کہا۔

”ہاں! یہ لوگ سارجنٹ رمیش کو پکڑ لائے تھے۔“ حمید نے کہا۔

اچانک مس جوزف نے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا اور پی سنگ دھاڑنے لگا۔ ”یہ ظلم

ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ ان لوگوں نے میری سیکریٹری کو زبردستی لے جانا چاہا تھا۔ رمیش

بہت پئے ہوئے تھا۔ وہ ادھر پڑا ہوا ہے، اور یہ دونوں ہم پر زبردستیاں کر رہے تھے۔“

”پی سنگ تمہاری بکواس کام نہیں آئے گی۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”ہاں ہاں..... آپ لوگ بادشاہ ٹھہرے، جو چاہیں کرتے پھریں۔“ پی سنگ ہانپتا ہوا بولا۔

”تمہارے پاس اس ریوالور کا لائسنس ہے۔“ حمید نے فرش پر پڑے ہوئے ریوالور کی

طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ اسے ہم نے استعمال کیا تھا کیونکہ اس کے

دستے پر صرف تمہاری ہی انگلیوں کے نشانات ملیں گے۔“

پی سنگ کا چہرہ اتر گیا۔

قاسم اور تیسری لڑکی

لڑکی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ وہ حمید کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر مغفلات بھی سنار ہی تھی۔

”کیا قصہ ہے جناب۔“ سب انپکٹر نے حمید سے پوچھا۔

”سب فراڈ ہے۔ اب یہ لوگ کیس بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ وہ ریوالور احتیاط

سے اٹھوا لیجئے۔ نشانات ضائع نہ ہونے پائیں۔“

پھر اس نے پی سنگ سے پوچھا۔ ”تم رمیش کو یہاں کیوں لائے تھے۔“

”میں لایا تھا۔“ پی سنگ عصبی آواز میں بولا۔ ”تم لوگ زیادتی بھی کرتے ہو اور الٹا

پھنسا بھی دیتے ہو۔ مس جوزف ایک اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔“

جب سے اسے کیڑی والا حادثہ پیش آیا تھا وہ کچھ اسی قسم کا ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ب زندگی کی لہر عموماً اسی وقت پیدا ہوتی تھی جب زندگی ہی خطرے میں ہو۔ سنگ سنگ بار میں اس وقت کے ہنگامے نے اس میں نئی روح بھونک دی تھی۔

اس نے قاسم کو اسٹیرنگ پر سے ہٹا دیا تھا اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہا تھا اور اتنے وحشیانہ انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا کہ قاسم کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ بار بار اُسے ایکسٹینڈ کا خطرہ محسوس ہونے لگتا مگر چونکہ ہیکٹر قسم کا آدمی تھا اس لئے اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جلد ہی سنگ سنگ بار کے سامنے پہنچ گئے جہاں اب پہلے سے بھی زیادہ بھیڑ نظر آرہی تھی۔ حمید اور قاسم مجمع میں گھستے چلے گئے۔ اندر سناٹا تھا۔ صرف دو کانشیل وہاں نظر آرہے تھے۔ حمید کو دیکھتے ہی ایک بولا۔

”صاحب وہ چینی بھاگ گیا۔“

”کیا.....؟“

”جی ہاں اور دوسرے تھانے میں ہیں۔ ہم انہیں یونہی لے جا رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے پاس ہتھیاریاں نہیں تھیں۔ بس ہیرا بازار کے قریب پہنچ کر غائب ہو گیا۔“

”غائب ہو گیا۔“ حمید نے حیرت سے دہرایا۔

”جی ہاں! ہمیں تو بالکل یہی معلوم ہوا جیسے وہ یا تو ہوا میں گھل گیا یا پھر اُسے زمین نگل گئی ہو۔ ہم غافل نہیں تھے جناب۔“

حمید سوچ میں پڑ گیا۔ اُسے ابھی تک ان حالات کا علم نہیں تھا جن کے تحت رمیش کی ”رگت بنائی گئی تھی۔ بہر حال وہ کوئی خاص ہی معاملہ رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق فریدی کی ذات سے ہو۔“

حمید چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس کی نظر سنگ بار کی بالائی منزل کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے ہارڈی کو دیکھا جو اوپر بار بے پر کھڑا سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ شہر کے شورہ پشت قسم کے بد معاشوں میں سے تھا اور بندرگاہ کے علاقے میں خصوصیت سے اس کی دھاک بٹھی ہوئی

رمیش کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی سرخ سرخ آنکھیں کھولتا اور اس طرح خلاء میں گھورنے لگتا جیسے اُسے کچھ دکھائی ہی نہ دے رہا ہو۔ نہ وہ کسی کی آواز سن کر اُس کی طرف دیکھتا اور نہ اس کے ہونٹ ہی ہلے۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سماعت اور بصارت سے محروم ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر نے اس کی پیشانی پر ابھری ہوئی نیلے رنگ کی دھاریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔ ”حمید صاحب! انہیں بہت سخت قسم کی اذیت دی گئی ہے۔ سر میں رسی پھنسا کر اس کا حلقہ اتنا تنگ کیا گیا ہے کہ یہ بیہوش ہو گئے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اندھے یا بہرے نہیں ہو جائیں گے۔“ اور حمید سوچ رہا تھا کہ آخر اُسے اذیت دی ہی کیوں گئی تھی۔ یہ طریقہ تو کچھ اگلا لینے ہی کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ آخر وہ لوگ اس سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے اور وہاں گیا ہی کیوں تھا۔

وہ اسے ہسپتال ہی میں چھوڑ کر پھر بندرگاہ کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ قاسم اب بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک بار بھی حمید سے یہ نہیں کہا کہ اب اُسے واپس جانا چاہئے۔

”اب کہاں!“ قاسم نے اس سے پوچھا۔

”وہیں سنگ سنگ بار۔“

”یار حمید بھائی مجھے افسوس ہے کہ ان میں سے ایک بھی نہیں مر سکا۔ مگر یار وہ مس جو جو..... الا قسم..... کیا چیز تھی۔“

”مس جوزف.....!“ حمید نے تھج کی۔

”کیسی زہریلی گالیاں دے رہی تھی۔“ قاسم ہنسنے لگا۔ ”چلو ہم دونوں قریب قریب برابر ہو گئے۔ میں نے لوٹروں کے ہاتھ سے مار کھائی تھی۔ تم نے گالیاں سن لیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ اب وہ مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ مگر یہ کہنا قطعی غلط ہوگا کہ اس ہنگامے نے اس کی طبیعت کو پہلے سے بھی زیادہ مکدر کر دیا ہوگا۔ یہ بات نہیں تھی۔ دھنسا حمید کو اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح پر سے اداسی کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ بیزاری دھوئیں کی طرح اڑ گئی تھی، جو پچھلے چند ہفتوں سے اس کے ذہن پر مسلط رہی تھی اور اب وہ خود کو پہلے ہی کی طرح کا سدا بہار محسوس کر رہا تھا۔

تھی۔ حمید نے سوچا ممکن ہے ہارڈی ہی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکے۔ اُسے یاد آیا کہ ایک فریدی نے ہارڈی کو ایک بہت بڑے جنجال سے بچایا تھا۔ ویسے اُس نے خود اُس کی تھوڑی مرمت ضرور کر دی تھی۔ فریدی تنہا تھا اور ہارڈی اپنے چار ساتھیوں سمیت اپنے ہی مکان میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اُس نے فریدی پر بھی بندرگاہ کے علاقے میں اپنی حکومت کا رعب چاہا لیکن اُس دن شاید ہارڈی کا ستارہ گردش ہی میں تھا کہ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے چار ساتھیوں کو بھی فریدی کے ہاتھوں بُری طرح پٹا پڑا تھا۔ اس کے بعد فریدی نے نہ صرف اُسے معاف کر دیا تھا بلکہ اُسے بہت بڑی مصیبت سے نجات بھی دلائی تھی۔

حمید نے سوچا ممکن ہے ہارڈی پی سنگ کی گرفتاری میں اُسے کچھ مدد دے ہی سکے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہارڈی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہارڈی نے اُسے دیکھا اور اس طرح کھل اٹھا جیسے اسے اس کا انتظار ہی رہا ہو۔

دومنت بعد ہارڈی نیچے آ گیا۔

”کام ادھور رہا پکتان صاحب۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر یہ سب کچھ ہوا کیے مجھے افسوس ہے کہ پی سنگ نکل گیا۔“

”اوہ تو کیا آج کل پی سنگ سے تمہارے تعلقات اچھے نہیں تھے۔“

”کبھی اچھے نہیں تھے۔ میں چینیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا اور پھر وہ تو انتہائی سُورِ آد ہے۔۔۔۔۔ مگر بات کیا تھی پکتان صاحب۔“

”اُس نے سار جٹ رمیش کو بند کر رکھا تھا، جو ہمیں بیہوشی کی حالت میں ملا۔ اُسے اب تک ہوش نہیں آیا۔“

”اور ایسے مجرم کو انسپکٹر صاحب نے نکل جانے دیا۔“ ہارڈی نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

”آہستہ سے بولا۔“ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دو چار ہزار کے نوٹ تھما دیئے ہوں۔“

”خدا جانے۔۔۔۔۔!“ حمید بولا۔ ”کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے۔“

”بھلا میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”پی سنگ نے شہر تو نہ چھوڑ دیا ہوگا۔“

ہارڈی کچھ سوچنے لگا۔ قاسم نے ہاتھ اٹھا کر ایک طویل انگڑائی لی اور اس طرح منہ چلانے لگا جیسے کچھ دیر قبل کھائی ہوئی مٹھائی کا مزہ اب ترشی میں تبدیل ہو گیا ہو۔ ساتھ ہی ایک ٹھنڈی سانس لے کر اُس نے اپنے پیٹ پر بھی ہاتھ پھیرا۔ جسمانی ورزش نے اُس کی بھوک چمکادی تھی۔

”آپ کی تعریف۔۔۔۔۔!“ دفعتاً ہارڈی نے قاسم کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کرٹل ٹاور۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا اور قاسم گدھے کی طرح پھول گیا اور ہارڈی کی طرف بڑی تحارت سے دیکھنے لگا۔

”تھکے میں نئے ہیں۔“ ہارڈی نے پوچھا۔

”تم مجھ سے پی سنگ کی بات کرو ہارڈی۔“

”پی سنگ۔“ ہارڈی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ”اس نے اپنی مٹی پلید کر لی۔ اب نہ وہ شہر چھوڑ سکے گا اور نہ یہی ممکن ہوگا کہ منظر عام پر آئے۔ اُس نے بھاگ کر سخت غلطی کی۔ ایک نہیں ہزار بہانے تھے۔“

”بہانہ تو اس نے بڑا شاندار پیدا کیا تھا۔“ حمید نے مسکرا کر کہا مگر پھر ایک غلطی کر بیٹھا۔ ”اگر وہ ریوالور نہ نکالتا تو ہم اپنی بے گناہی کسی طرح نہ ثابت کر سکتے۔ ریوالور بغیر لائسنس کا تھا اور اس کے دستے پر صرف اسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ وہ محض اس ریوالور کی وجہ سے بھاگ نکلا ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ ہمیں تارے نظر آ جاتے۔“

”میں کچھ نہیں سمجھا پکتان صاحب۔“ ہارڈی نے پر اشتیاق لہجے میں کہا۔

اس پر حمید نے بے کم و کاست پوری داستان دہرا دی۔ قاسم کو بڑا غصہ آیا۔ اُسے بھوک لگی ہوئی تھی اور وہ اس انتظار میں تھا کہ ہارڈی کھسکے تو وہ حمید سے کسی ہوٹل میں چلے کی فرمائش کرے۔ مگر بات تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

”اچھا بس! خواہ مخواہ بے گنی ہانک رہے ہو۔“ قاسم غرایا۔

”میں آپ لوگوں کا بداندیش نہیں ہوں جناب۔“ ہارڈی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کام ہی

آ جاؤں۔“

”مجھے کھا جاؤ۔“

قاسم ہنسنے لگا۔ مگر اس کی ہنسی بڑی بے جان تھی، قہقہے کے اختتام پر بالکل ایسی ہی آواز اس کے حلق سے نکلی جیسے کوئی گدھا ریک رہا ہو۔

”چلو..... یہاں کوئی ایسا ہوٹل نہیں ہے جہاں تمہارے معیار کے مطابق کھانا مل سکے۔“

حمید کار کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

وہاں سے دونوں آرلکچو میں آئے جہاں ان کی شخصیتیں گناہ نہیں تھیں۔ خصوصاً قاسم تو دیڑوں سے لے کر فیجریک کی آنکھوں کا تار تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر بے تحاشہ کھاتا اور بے تحاشہ پیے بانٹا۔ کاؤنٹر کلرک ایک اینگلو بریٹش لڑکی تھی اس لئے قاسم بلا ناغہ یہاں آتا تھا۔ قاسم ایک میز پر جم گیا اور حمید کاؤنٹر پر پہنچ کر سول ہسپتال کے نمبر رنگ کرنے لگا۔ اسے معلوم کرنا تھا کہ فریدی وہاں پہنچا یا نہیں۔ وہاں سے اسے ہولڈ ان کرنے کے لئے کہا گیا کیونکہ فریدی وہاں موجود تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد فریدی کی آواز آئی جو اسے سول ہسپتال پہنچنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ حمید ریسپورر رکھ کر قاسم کی میز پر آیا۔

”تم زہر مار کرو..... میں جا رہا ہوں۔“

”جاؤ.....!“ قاسم نے بڑے مخلصانہ انداز میں کہا۔ اس نے کاؤنٹر کلرک کو حمید کی طرف دیکھ کر بڑے دلاویز انداز میں مسکراتے دیکھا تھا اور اس کی ہڈیاں سلگ گئی تھیں۔ یہ اینگلو بریٹش لڑکی قاسم کو بہت پسند تھی کیونکہ وہ اس سے بھی مسکرا کر ہی گفتگو کرتی تھی۔ وہ ہر گاہک سے مسکرا کر گفتگو کرتی تھی لیکن قاسم کے لئے یہ بھی ناقابل برداشت تھا۔ وہ ہر اس لڑکی کو اپنی ملکیت سمجھنے لگتا جو اس سے سیدھے منہ بول لیتی۔

حمید چلا گیا۔ قاسم بیٹھا کھانے پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ اس کی میز پر ہمیشہ دو ویٹر ہوا کرتے تھے۔ پتہ نہیں کب کسی آرڈر کے سلسلے میں ایک کی غیر حاضری دوسرے آرڈر کی تعمیل میں خارج ہو جائے۔ کھانے کے دوران میں اس کی فرمائشات کا سلسلہ برابر جاری رہا کرتا تھا۔ اور آج تو اس نے بھوک کی شدت کی وجہ سے حد ہی کر دی تھی۔ پوری میز پلیٹوں

”اسی وقت کام آؤ گے؟“ قاسم نے غڑھالی آواز میں پوچھا۔

ہارڈی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ وہ تو اسے حکمہ سراغ رسانی کا کوئی آفسر سمجھا تھا۔ قہقہے

اس کے کہ وہ اس جملے کی وضاحت چاہتا حمید بول پڑا۔

”اگر کام ہی آتا ہے تو دیر نہ کرو۔“

”دیکھئے..... میرا خیال ہے کہ پی سنگ اس وقت کارپینٹر کے قمار خانے میں ہوگا۔ میں نے غلط نہیں کہا تھا کہ پی سنگ شہر نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کارپینٹر کے قمار خانے کا مالک دراصل پی سنگ ہی ہے۔“

”میرے لئے نئی اطلاع ہے۔“

”ہے نا!“ ہارڈی چپک کر بولا۔ ”پی سنگ کروڑوں کا آدمی ہے اور اس نے مختلف

ناموں سے درجنوں کاروبار کر رکھے ہیں۔“

”اچھا تو پھر ہم کارپینٹر کے قمار خانے ہی میں کیوں نہ چلیں۔“

”ابھی نہیں..... ایک بجے سے پہلے ہرگز نہیں۔“

”ابج بجے۔“ قاسم دہازا۔

”جی ہاں..... احتیاط.....!“ ہارڈی جلدی سے بولا۔ وہ اسکے ذیل ڈول سے بہت مرعوب

معلوم ہو رہا تھا۔ حمید نے پھر اسے اپنی طرف مخاطب کرنے کیلئے کہا۔ ”اچھا تم کہاں ملو گے۔“

”یہیں اپنے فلیٹ میں۔ اب مجھے جانے دیجئے۔ پی سنگ بڑا چالاک ہے۔ وہ جہاں

بھی ہوگا اس تک ایک ایک لحظہ کی خبریں پہنچ رہی ہوں گی۔“

”بہتر ہے جاؤ۔“ حمید نے کہا۔ ”میں ساڑھے بارہ بجے تک تمہارا انتظار کشم کر اسنگ پر

کروں گا! لیکن سونہ جانا۔“

”نہیں جناب ایسا بھی کیا۔“ ہارڈی نے کہا اور اپنے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔

”غمید بھائی۔“ قاسم کے حلق سے ایک دردناک سی آواز نکلی۔

”بھوکے ہوا!“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں.....!“

وہی تمہارے سر پر توڑ دوں گا۔“

”کئی لوگ اپنی میزوں سے اٹھ کر ان کے قریب آ گئے اور قاسم زہر ہی زہر کے نعرے

"-1-18

لیکن جلد ہی اس کی آواز دب گئی کیونکہ وہ اندھ دیشنی لڑکی بھی اٹھ کر اس کی میز کے قریب آئی تھی۔ اس کی رنگت گندمی تھی اور چہرہ مٹیج تھا۔ ہونٹوں پر ہلکے رنگ کی لب اسٹیک اس کی ہنسی سیلتگی کی دلیل تھی۔

تاسم اُسے قریب دیکھ کر یلکھت خاموش ہو گیا اور اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”کک..... کافی.....!“ قاسم ہکھلایا۔ ”آؤٹ آف..... آرڈر..... معلوم ہوتی ہے۔“

”اوہو..... تو اس پر اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ لڑکی اٹھلائی۔ ”آدمی کو

انسانیت کے جامے سے باہر نہ ہونا چاہئے۔“

”جج..... جی..... ہاں..... جہاں..... ٹھیک ہے۔“ قاسم اس وقت صحیح الفاظ ادا کرنے

رہا۔ وہ ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔ لوگ انہی میزوں کی طرف واپس گئے لیکن لڑکی وہیں کھڑی

تاسم نے تھوک نکل کر بدقت تمام کہا۔ ”ترشف..... تشرف..... رر رکھے۔“

”میں محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کی اصلاح کی ضرورت ہے۔“ لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جج..... جی..... ہاں اور کیا۔“ قاسم نے رومال سے اپنے جھریے کا سینہ خشک کرتے

وئے کہا۔

آدمی اور جانور میں کیا فرق ہے۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”مم..... میں سوچ کر جواب دوں گا..... ابھی..... ذرا ٹھہرے۔“ قاسم نے کہا اور کچھ

لگا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ منٹ بعد مسکرا کر بولا۔ ”آدمی کے دم نہیں ہوتی..... جی ناں.....“

"فَعَلَمَ"

”چلے میں آپ کو بتاؤں کہ انسانیت اور آدمیت کسے کہتے ہیں۔“

”چلو..... کہاں..... ہی..... ہی..... ہی..... ضرور..... ضرور.....“

آج بھی کچھ اسی قسم کی واردات ہوگی۔ ہوا یہ کہ قاسم نے کھانے کے بعد کافی طلب کی اور اس انڈونیشی لڑکی میں دلچسپی لیتا رہا، جو اُس کے قریب ہی کی ایک میز پر تنہا بیٹھی تھی۔ اُس کے ہونٹ اور آنکھوں کے نیچے کے اُبھار قاسم کو بہت پسند آئے تھے۔ وہ لڑکی بھی ہیکھیوں سے کبھی کبھی قاسم کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ قاسم نے اُسے محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک بار نظریں نیچی کر کے مسکرائی بھی تھی۔ قاسم اُسے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اُس نے کافی میں شکر کی بجائے تین چمچے دانے دار نمک کے ڈال لئے اور پھر عادت کے مطابق ایک بڑا سا گھونٹ لیا، جو منہ میں رکے بغیر حلق سے نیچے اتر گیا۔

”اع.....عی.....عی.....!“ اس نے ہونٹ پھیلا دئے اور اُکاٹاں لئے لگا۔ خیریت

یہی ہوئی کہ کپ ہاتھ سے چھوٹ فرش پر نہیں گرا۔

”خدا..... تم..... غم..... غارت کرے۔“ وہ ویٹر کی طرف مڑ کر دھاڑا۔

”جی صاحب!“ ویٹر چونک کر بولا۔

”یہ کیسی شکر ہے۔“ قاسم کی غراہٹ بوزے ڈانٹنگ مال میں رہی گئی۔

”شکر ہے صاحب۔“ ویٹر نے بوکھلا کر جواب دیا۔

”زہر ہے۔“ قاسم اُسی آواز میں چیخا۔ ”حکیم“

”میرا ایک اصلاح خانہ ہے۔ میں آپ کو آدی بنا دوں گی۔“

قاسم خوش بھی تھا اور بدحواس بھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے بل کے دام چکائے اور اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔..... تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھے کسی نامعلوم منزل کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ کم از کم قاسم کے لئے تو وہ ”منزل“ نامعلوم ہی تھی۔ اس نے بھی پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ وہ اُسے کہاں لے جا رہی ہے۔

یہ سفر شاید ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ قاسم راستے بھر پچھلی سیٹ پر پڑا آنکھیں بند کرنا پنا رہا تھا۔ اس لئے وہ نہ دیکھ سکا تھا کہ ٹیکسی شہر سے نکل کر ویرانے کی طرف جا رہی ہے ویسے اگر دیکھ بھی لیتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ ٹیکسی ایک جگہ رکی اور اُسے لڑکی کی مٹرزم آواز سنائی دی، جو اس سے نیچے اترنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ شہر سے یہاں تک ٹیکسی ڈرائیو کے پہلو میں بیٹھ کر آئی تھی، جیسے ہی قاسم کار سے اتر اس کی آنکھوں کے سامنے چمکدار شعلے اڑنے لگے اور وہ دوسرے ہی لمحے میں کسی تناور درخت کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا..... سر ہلکنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی۔

کیا فریدی پاگل تھا

فریدی کی پیشانی پر سلوٹس تھیں اور وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا..... تھوڑی دیر بعد اس نے حمید سے کہا۔

”ریش کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔“

”یعنی.....!“ حمید بوکھلا گیا۔ اُسے ریش سے بڑی محبت تھی۔
”ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ شاید اس کا ذہنی توازن ہمیشہ کے لئے بگڑ جائے۔“
”مجھ میں نہیں آتا کہ پی سنگ نے ایسی جرات کس طرح کی۔“ حمید نے کہا۔

”پی سنگ.....!“ فریدی نے اپنا نچلا ہونٹ پھر دانتوں سے دبایا اور کچھ دیر بعد بولا۔

”پی سنگ پر بہت عرصہ سے میری نظر تھی۔ ریش عرصہ سے اُس کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ کیس سے پی سنگ کا کیا تعلق ہے۔“

”موجودہ کیس سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”وحشی لڑکیاں۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا اور خاموش ہو گیا۔

”میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیس کس طرح سے ہے۔“

”کیوں.....!“

”آپ کا یہی خیال ہے نا کہ یہ کوئی مرض نہیں ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے وہ ناخن اکھاڑو یا کوئی مرض نہیں تھی۔“

”ہاں میرا خیال یہی ہے۔“

”مگر آپ نے اس کے مقصد پر بھی غور کیا ہے۔“

”یہ بجائے خود مقصد ہے۔“

”وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد بھی میں.....!“

”وضاحت! قبل از وقت ہوگی۔ تم اسکی پرواہ نہ کرو۔ ہو سکتا ہے میں غلطی ہی پر ہوں۔“

”خیر..... جانے دیجئے! ویسے میری دانست میں اگر لڑکیوں کا یہ وحشیانہ پن بجائے خود

ایک مقصد ہے تو اس میں جرم کہاں سے آئے گا اور اگر جرم ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ اگر

ایک لڑکی کسی دوکاندار کو چاقو مار دیتی ہے یا اگر کوئی لڑکی اپنے باپ پر چاقو لے کر دوڑتی ہے یا

کلاک ٹاور پر پتھراؤ کرتی ہے تو آپ ان سارے واقعات کو ایک ہی رشتے میں کیسے منسلک

کریں گے۔ ناخن اکھاڑو یا کا شکار تو ملک کے بہت بڑے بڑے لوگ ہوتے تھے اور اس کا

مقصد یہ تھا کہ قوم کو بہترین قسم کے دماغوں سے محروم کر دیا جائے۔ مگر اس کیس میں!“

”ہاں ٹھیک ہے! واقعات ایسے ہی ہوتے ہیں کہ انہیں ایک رشتے میں منسلک نہیں کیا

جاسکتا لیکن کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ صرف طالب علم لڑکیاں ہی اس وباء کا شکار ہو رہی

ہیں اور لڑکیاں بھی وہ جو مالدار طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔“

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ مقصد کیا ہے۔“

”یہ ابھی نہیں بتا سکتا۔ خود مجھے بھی معلوم نہیں..... لیکن۔“

فریدی پھر کچھ سوچنے لگا۔

حمید نے اپنے پائپ میں تبا کو بھری اور اُسے سلگاتا ہوا بولا۔ ”ویسے جہاں تک روحی کا تعلق ہے اُس سے گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور کچھ اس انداز میں کہ ساتھ ہی ساتھ چیلنج بھی کرتی جاتی تھی کہ سرکاری سرانصراس بھی اسے نہ معلوم کر سکیں گے جو کچھ وہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”لیکن تم اُسے یاد رکھنا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”وہ لڑکی ہماری معلومات کا ذریعہ ضرور بنے گی۔“

”یعنی آپ کو توقع ہے کہ وہ خود ہی سب کچھ اگل دے گی۔ برضا و رغبت۔“

”نہیں بلکہ وہ ہمیں شکست دینے کے خطبہ میں مبتلا ہو کر یقینی طور پر حماقتیں کرے گی۔“

”یہ ستاروں کی چال کے مطابق پیشین گوئی ہے یا آپ کی جمالیاتی حس۔“

”تم مجھ پر طر کر رہے ہو۔“ فریدی مسکرایا۔

”نہیں میں نہایت شرافت سے گفتگو کر رہا ہوں۔ ویسے میں آپ کو مطلع کر دوں کہ قاسم اُسے اپنی طرف متوجہ کی فکر میں ہے۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ پیشین گوئی محض اس کی افتاد طبع کی بناء پر تھی۔“

”خیر!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”اب میں ہارڈی سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”جاؤ.....!“ فریدی بولا۔ ”مگر میرا دل نہیں چاہتا کہ ہارڈی پر اعتماد کر لوں۔“

”پی سنگ سے اُس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے اس کا علم ہے۔“

ہارڈی سمجھتا ہے کہ بندرگاہ کے علاقہ پر خود چھایا ہوا ہے، اور پی سنگ! وہ تو وہاں کا بے تاب بادشاہ سمجھا ہی جاتا رہا ہے حالانکہ دونوں میں آج تک کھلم کھلا ٹکراؤ نہیں ہوا، مگر اندرونی حالات سے میں بے خبر نہیں ہوں۔“

”تمہاری مرضی..... ویسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“

”تو آپ بھی چلے نا۔“

”میں بے بس تو نہیں ہوں کہ ہارڈی جیسے چھپھورے آدمیوں سے مدد طلب کروں۔“

”طاقت والے کیس میں کیا ہوا تھا۔“ حمید کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔

”میرے گھونٹوں نے اُس سے حقیقت اُگلوائی تھی..... اب تم جا سکتے ہو۔ میرا دماغ نہ

پاؤ لیکن گاڑی نہ لے جانا۔“

”ہائیں..... پیدل!“

”جاؤ..... میرا وقت نہ برباد کرو۔“

حمید لباس تبدیل کر کے باہر آیا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ایک ٹیکسی چسلی اور کشم کراسنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہارڈی کے معاملے میں اس نے فریدی کو مطمئن کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ مگر اب خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ فریدی کے اندازے بہت کم غلط ثابت ہوا کرتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ہارڈی سچ سچ نہ دھوکا دے جائے مگر اب تو چل ہی پڑا تھا۔ واپسی پر بڑی مضحکہ خیز ہوئی۔ فریدی اس پر ضرور پھبتیاں کستا۔ اس نے سوچا کہ وہ کاربینٹر کے قمار خانے میں قدم بھی نہ رکھے گا۔ اس طرح ہارڈی کا بھی امتحان ہو جائے گا۔“

کشم کراسنگ پر ہارڈی اس کا منتظر تھا۔

”کیا آپ تنہا ہیں۔“ اس نے حمید سے پوچھا۔

”نہیں تم بھی تو ہو میرے ساتھ.....!“ حمید اس کا شانہ چھپکا ہوا بولا۔

”تب پھر میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا کہ آپ کاربینٹر کے قمار خانے میں قدم بھی رکھیں۔ وہ بہت بُری جگہ ہے۔ آپ کو اس کا علم ہے کہ وہاں غیر قانونی طور پر جوا ہوتا ہے لیکن کیا ایک بار بھی پولیس کا چھاپہ کامیاب ہو سکا ہے؟“

”ٹھیک ہے! ابھی تک ہم اُسے قمار خانہ نہیں ثابت کر سکے۔“ حمید بولا۔

”پھر یہ کہاں کی عقلندی ہے کہ آپ وہاں تنہا جائیں۔“

”میں بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں پسند کرتا۔“ حمید نے جواب دیا۔

”میں کب کہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ دس پانچ آدمی اندر لے جائیے۔ وہاں تو بس دو ہی جائیں گے۔“

”پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”کم از کم دس آدمیوں کو باہر موجود رہنا چاہئے جو ضرورت پڑنے پر اندر بلائے جاسکیں۔“
”لیکن اس وقت ایسے آدمیوں کا مہیا ہونا ممکن نہیں ہے۔ ویسے غالباً تمہاری مراد سادہ لباس والوں سے ہے۔“

”جی ہاں! میں یہی چاہتا ہوں۔ کم از کم دس سادہ لباس والے۔“

”بہت مشکل ہے..... آؤ تم ڈرتے کیوں ہو۔“

”میں ڈرتا نہیں ہوں۔“ ہارڈی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو آپ ہی کے بھلے کے لئے کہا تھا۔ رہ گیا میرا معاملہ تو وہ خود کار بینٹر کا قمار خانہ ہو خواہ محکمہ سرانفرسانی کا دفتر میں ہر جگہ اپنی ہی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہوں۔“

”چلو بیٹھو.....“ حمید نے اُسے ٹیکسی میں دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھی سب جانے ہیں۔ خواہ وہ کار بینٹر کا قمار خانہ ہو خواہ کسی درزی کی دوکان۔“

”آپ کی مرضی۔“ ہارڈی ٹیکسی میں بیٹھتا ہوا بڑبڑایا اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ حمید ہارڈی کے پاس ہی کچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

”سارجنٹ ریش والے معاملے کے متعلق کرنل صاحب کا کیا خیال ہے۔“ ہارڈی نے پوچھا۔
”پتہ نہیں! شام سے اب تک میری اور ان کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ ریش کی حالت بہت نازک ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ پاگل ہو جائے گا۔“

”یعنی واقعی..... پی سنگ کی شامت آگئی ہے۔“ ہارڈی اس طرح بڑبڑایا جیسے خود سے مخاطب ہو۔

کار بینٹر کے قمار خانے سے تھوڑے فاصلے پر انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی آگے بڑھے۔ دفعتاً ہارڈی نے رک کر کہا۔ ”ہم گویا موت کے منہ میں کودنے جا رہے ہیں۔ میں ایک بار پھر آپ کو باز رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر پی سنگ وہاں موجود ہو تو وہاں سے“

باہر نکلتا مشکل ہو جائے گا۔“

”ہاں! ایک بات میں مان سکتا ہوں کہ قمار خانے والے میری صورت دیکھتے ہی میزک جائیں گے۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔“ ہارڈی بولا۔

”اچھا تو پھر ایک دوسری صورت بھی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اس طرح شاید میں کسی قسم کے خطرے میں پڑے بغیر ہی کامیاب ہو جاؤں۔“

”وہ کیا.....؟“

”صرف تم اندر جاؤ..... اگر پی سنگ موجود ہو تو مجھے مطلع کر دینا۔ پھر اس کے فرشتے بھی وہاں سے نہ نکل سکیں گے۔“

”اب آپ آئے ہیں قرینے پر۔“ یہی میں بھی چاہتا ہوں۔ اچھا آپ جین باری میں میرا انتظار کیجئے۔ میں نے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ کہیں آپ کو میری نیت میں فتور نہ نظر آنے لگے۔

”ارے..... واہ.....!“ حمید ہنسنے لگا۔ ”اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو یہاں تک آتا ہی کیوں اور اگر آتا بھی تو تنہا کبھی نہ آتا۔“

ہارڈی اسے وہیں چھوڑ کر ایک نیم روشن گلی میں گھس گیا اور حمید ٹھٹھٹا ہوا جین باری کی طرف چلا جو یہاں سے صرف دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔

لیکن وہ ابھی اس کے دروازے کے قریب بھی نہیں پہنچا تھا کہ ایک آدمی بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا اس کے قریب سے نکلا اور کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر فٹ پاتھ پر گر پڑا۔

”ارے.....!“ حمید کے منہ سے میساخہ نکلا۔ یہ گرنے والا ہارڈی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ حمید جھپٹ کر اُسے اٹھانے لگا۔

”اوہ..... کیپٹن!“ ہارڈی بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ ”وہ نکلا جا رہا ہے۔ وہ اُدھر۔“ اُس نے بڑی تیزی سے مڑ کر مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ سڑک سنسان تھی اور تھوڑے ہی فاصلے پر صرف ایک چلتی ہوئی کار کا عقبی حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

پھر وہ اچھل کر کھڑا ہوتا ہوا متا سفا نہ لہجے میں بولا۔ ”کیا کریں..... وہ نکل جائے گا۔“
 ٹیکسی بھی نہیں ہے۔“

پھر دفعتاً وہ سڑک کے دوسرے کنارے کی طرف دوڑنے لگا۔ حمید نے بھی اس کا ہاتھ دیا۔ دوسری طرف فٹ پاتھ سی لگی ہوئی ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

ہارڈی نے اُسے بڑی پھرتی سے اشارت کیا اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بیٹھ جائیے۔“
 ”پتہ نہیں کس کی ہو۔“ حمید بڑبڑایا۔

”قانون آپ کا ساتھ دے گا کیونکہ آپ ایک مجرم کا تعاقب کر رہے ہیں..... چلے۔“
 حمید کیریز پر بیٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحے میں موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

”واہ رے مقدر.....!“ ہارڈی ہنس کر بولا۔ ”موٹر سائیکل بھی دائر کول انجن کی ہے بالکل بے آواز۔“

اگلی کار شہر سے ویرانے کی طرف جا رہی تھی۔ شہر سے نکلتے ہی ہارڈی نے موٹر سائیکل کی ہینڈ لائٹ بجھا دی۔

”یار کہیں ایکسٹنٹ نہ کر بیٹھنا۔“ حمید بڑبڑایا۔
 ”میں اتناڑی نہیں ہوں کپتان صاحب!“

حمید دل ہی دل میں اس کی پھرتی اور مستعدی کی تعریف کر رہا تھا۔ اگلی کار کی رفتار خاموش تیز تھی۔ اس میں اور موٹر سائیکل کے درمیان دو فرلانگ کا فاصلہ ضرور رہا ہوگا۔ اچانک ایک جگہ

کار رک گئی اور ادھر ہارڈی نے بھی بربیک پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ موٹر سائیکل کی رفتار کم ہو گئی۔
 ”ہوشیار.....!“ ہارڈی نے تیز قسم کی سرگوشی کی۔ حمید نے پیر نیچے لٹکا دیئے۔

سائیکل رک گئی۔ وہ اب بھی کار سے کچھ فاصلے پر تھی۔
 حمید کیریز سے اتر ہی رہا تھا کہ اچانک اُسے گھٹن کا احساس ہوا۔ کوئی چیز تیزی سے اس

پر گری تھی اور پھر اُسے ہاتھ پیر ہلانے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ سر سے پیر تک ایک کبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے یلغٹ اپنے پورے جسم کا زور صرف کر کے اس وبال سے نکلنے کی کوشش کی مگر

کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ لوگ تعداد میں پانچ تھے اور پانچوں نے ٹیکڑوں کی طرح اپنے بازو

اس کے گرد جمادیئے تھے۔ حمید نے ہارڈی کے قہقہے کی آواز سنی جس میں کسی دردے کی سی غراہٹ بھی شامل تھی۔

پھر اُس کے پیر زمین سے خود بخود اٹھ گئے۔ حمید نے ایک بار پھر رہائی کے لئے جدوجہد کی لیکن بے سود۔ کبل میں اس کا دم گھٹ رہا تھا

لیکن جب وہ لوگ اسے اٹھا کر چلنے لگے تو اس کے چہرے پر ہلکی سی ٹھنڈی ہوا لگی جس کی بناء پر اوسان بجا رکھنے میں مدد مل گئی۔

پھر ایک جگہ اُسے زمین پر پٹخ دیا گیا۔ حمید نے بے تحاشہ جست لگائی اور کبل سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اُسے کئی تسخّر آمیز قہقہے سنائی دیئے لیکن اسے حسرت نکالنے کا موقع نہ مل سکا

کیونکہ اس کی طرف پانچ ریوالور کی ٹالیں اٹھی ہوئی تھیں۔ ہارڈی نے بڑھ کر اس کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

یہ کچی دیواروں کا ایک وسیع کمرہ تھا اور یہاں آٹھ آدمی تھے۔ پانچ وہ جن کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ چھٹا ہارڈی ساتواں پی سنگ جس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص

کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت حمید کو آٹھویں آدمی پر ہوئی۔ یہ آٹھواں آدمی قاسم تھا جسے ایک کرسی میں بٹھا کر رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خون نظر آ رہا تھا اور قمیض

بھی سینے تک خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ بیہوش نہیں تھا۔ تیل سے جلنے والے لیمپ کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

”حمید صاحب۔“ ہارڈی نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ جگہ بڑی پر فضا ہے۔ تھوڑی سی دور پر ایک

تالاب ہے جہاں مولسری کے کئی درخت ہیں۔ وہیں میں نے آپکی قبر کیلئے جگہ منتخب کر لی ہے۔“
 ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں پہلے طوائفوں کے محلے میں

اپنے لئے زمین الاٹ کرا چکا ہوں۔“
 ”ذرا سی دیر میں ساری زبانی طراریاں دھری رہ جائیں گی کپتان صاحب۔“

”خبردار حمید بھائی۔“ دفعتاً قاسم دھاڑا۔ ”ان حرامزادوں کو وہ بات ہرگز نہ بتانا۔“
 حمید سمجھ گیا کہ وہ اُس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر قاسم کو کس بات کا علم

باندھ بیٹا۔

”اے تم لوگ بالکل عورت ہو۔“ قاسم بڑبڑایا۔ ”صرف میرا ایک ہاتھ کھول دو پھر میں نہیں تماشادکھاؤں۔“

”تمہاری یہ حسرت بھی پوری کر دی جائے گی۔“ ہارڈی مسکرا کر بولا۔ ”مگر سب سے پہلے تماشاپیش کرنے کا فخر ہم حاصل کریں گے۔“

ایک آدمی باہر چلا گیا۔ غالباً وہ انگلیٹھی میں کوئلے دھکانے کے لئے گیا تھا۔ ہارڈی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک سناٹے میں ایک نسوانی چیخ گونجی۔ ”بچاؤ..... بچاؤ۔“

”یہ کون ہے؟“ پی سنگ نے ہارڈی سے پوچھا جو دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”پتہ نہیں۔“ ہارڈی نے رک کر کہا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر پی سنگ کی طرف

ڑے بغیر بولا۔ ”کیا یہاں کوئی عورت بھی تھی۔“

”تھی۔“ پی سنگ نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ ”مگر اب نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسے واپس جانے کی تاکید کر دی تھی..... اور!“

چیخ پھر سنائی دی لیکن اس بار ایسا معلوم ہوا تھا جیسے یہ آواز دور سے آئی ہو۔ یقینی طور پر ہلکی چیخ کی آواز اتنی دور سے نہیں آئی تھی۔

”جاؤ دیکھو.....!“ پی سنگ نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

چاروں آدمی باہر نکل گئے۔ ہارڈی نے بھی جانا چاہا لیکن پی سنگ بول پڑا۔

”تم یہیں ٹھہرو گے۔“ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

”کیوں.....؟“ ہارڈی غرا کر پلٹا۔ شاید اسے اس کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

”تم میرے ساتھ ہی باہر نکلو گے۔“

”تم ہوش میں ہو یا نہیں..... کیا میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔“

”نہیں تم تو میری محبوبہ کے نوکر کے باپ ہو۔“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے پی سنگ تم بڑے کیے معلوم ہوتے ہو۔ ہارڈی نے تمہارے لئے کتنی محنت کی ہے، اگر میں ہارڈی کی جگہ ہوتا تو مار مار کر تمہارا بھر کس نکال دیتا۔“

تھا؟ حمید سوچنے لگا۔ مگر پھر حقیقت اس پر روشن ہو گئی..... موٹی عقل والے بھی اپنی زندگی خطرے میں دیکھ کر حیرت انگیز طور پر عقلمند ہو جاتے ہیں۔ قاسم نے شاید اسی میں اپنی بہتری سمجھی تھی کہ خواہ مخواہ جھوٹ بولتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اُن سے یہی کہا ہو کہ وہ کوئی اہم بات جانتا ہے۔ مگر بتائے گا نہیں کیونکہ ایسی صورت میں عموماً خاموشی ہی پر زندگی کا انحصار ہوا کرتا ہے۔

”بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کرو تو بہتر ہے۔“ پی سنگ نے ہارڈی سے کہا۔

”مجھے تمہارے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ہارڈی خشک لہجے میں بولا۔ ”میں نے تو یہ سب کچھ اپنی روح کی تسکین کے لئے کیا ہے۔ ان میں سے اگر ایک کو بھی میں جان سے مار سکا تو سمجھوں گا کہ میری زندگی فضول نہیں ضائع ہوئی۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو احسان فراموش کتے!“ حمید گرجا۔

”ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ایسی اذیتیں دے کر ہلاک کروں گا کہ.....!“

”کیپٹن حمید!“ پی سنگ کی آواز ہارڈی کی آواز پر حاوی ہو گئی اور ہارڈی اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگا۔ وہ خاموش ہو گیا لیکن نفرت سے ہونٹ سکڑتے ہوئے دوسری طرف دیکھتا رہا۔

”کیپٹن حمید!“ پی سنگ بولا۔ ”تم لوگ کس چکر میں ہو۔“

”میں تو مس جوزف کے چکر میں ہوں۔ دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”شاباش حمید بھائی۔“ قاسم نے قہقہہ لگایا۔ ”ڈراما مت۔“

قاسم نے یہ قہقہہ زبردستی لگایا تھا۔ حمید نے اسے محسوس کر لیا۔

”یہ کبھی نہیں بتائیں گے۔“ دفعتاً پی سنگ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اسے بھی باندھ دو اور انگلیٹھی میں کوئلے دھکاؤ۔“

”آہا..... اب تم نے کام کی بات کی ہے۔“ ہارڈی بیساختہ ہنس پڑا۔ ”یہ خدمت مجھے سوپ دو۔ میں اس کے جسم کی ساری چربی نکال لوں گا۔“

حمید کو بھی ایک کرسی میں گرا کر ہاتھ پیر سیوں سے جکڑ دیئے گئے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں لیکن یہ محال تھا کیونکہ بیک وقت چھ آدمی اس سے لپٹ پڑے تھے اور پی سنگ نے ریوالور سنبھال لیا تھا۔ آخر کار انہوں نے حمید کو بے بس کر کے

”شٹ اپ.....!“ پی سنگ چیٹا۔

”جی بات کرونی لگتی ہے۔ ہارڈی تم سے کمزور نہیں ہے۔“ حمید بولا۔

اس وقت پی سنگ کے ہاتھ میں ریو اور نہیں تھا۔ اُسے وہ پہلے ہی جیب میں ڈال دیا تھا۔ دفعتاً ہارڈی نے پی سنگ پر چھلانگ لگادی لیکن پی سنگ کی بجائے وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ پی سنگ دور کھڑا جیب سے ریو اور نکال رہا تھا۔

”تم اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرو گے۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور ہارڈی جہاں وہیں تھم گیا۔

”پی سنگ..... ریو اور زمین پر ڈال دو۔“ دروازے سے فریدی کی آواز آئی۔

پی سنگ کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

پی سنگ نے چپ چاپ ریو اور زمین پر ڈال دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اڑ کر کھڑکی سے گذر گیا ہو۔ ساتھ ہی ایک فائر بھی ہوا لیکن حمید کی دانست میں فریدی نے کارتوس ہی برباد کیا تھا۔ پی سنگ کے مقابلے میں وہ اس وقت کم پھر سٹلا ثابت ہوا تھا۔

حوالات میں حُسن

”آہا..... ہارڈی! تم اس کی نقل کر کے کامیاب نہیں ہو سکتے۔“ فریدی نے کہا۔ وہ ڈالا اچال گیا۔ ایسا احمق نہیں ہے کہ دوبارہ پلٹ کر خود کو خطرے میں ڈالے۔

”نہیں کرل۔“ ہارڈی جواباً مسکرایا۔ ”مجھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے، میری نیت صاف تھی۔“

”ذرا اس کی بھی وضاحت کر دو۔“

”میں جانتا تھا کہ آپ آئیں گے۔ اگر میں ڈرامہ نہ کھیلتا تو پی سنگ کا پھنسا محال

لیکن آپ کی جلد بازی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔“

”اوہو! تو گویا تم نے مصلحت یہ سب کچھ کیا تھا۔“

”جی ہاں! اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ اگر میں کپتان صاحب کو پہلے ہی سب

بتا دیتا تو میں اتنی سچی اداکاری بھی نہ کر سکتا۔“

”ان دونوں کو کھول دو۔“ فریدی نے قاسم اور حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کھول دوں گا۔“ ہارڈی نے کہا۔ ”لیکن آپ پی سنگ کو دیکھئے۔ اگر اُسے متوقع مل

گیا تو ہمارا یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“

”میں تمہارے مشورے کا محتاج نہیں ہوں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”جو میں

کہہ رہا ہوں کرو۔“

”شاید آپ میری طرف سے بدگمان ہیں۔“

”ہارڈی!“ فریدی غرایا۔

ہارڈی چپ چاپ آگے بڑھا اور حمید کو کھولنے لگا۔ وہ ہتھکیوں سے فریدی کی طرف بھی

دیکھتا جا رہا تھا لیکن فریدی خاموش کھڑا رہا البتہ ریو اور کا رخ اب بھی ہارڈی ہی کی طرف تھا۔

حمید نے چھوٹے ہی ہارڈی پر حملہ کر دیا۔

”خبردار..... نہیں۔“ فریدی نے سخت لہجے میں کہا اور حمید برا سامنے بنائے ہوئے پیچھے

ہٹ گیا۔

ہارڈی کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ فریدی جیسے آدمی کی طرف سے مطمئن

نہیں ہو سکتا تھا۔ اچانک باہر قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پی سنگ کے پانچوں آدمی کمرے

میں داخل ہوئے۔ لیکن جیسے ہی انکی نظر فریدی پر پڑی انہوں نے دروازے کی طرف پلٹنا چاہا۔

”تھہرو.....!“ فریدی نے انہیں لٹکارا۔ ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

وہ سب جہاں تھے وہیں رک گئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ بھی اٹھا دیئے۔ کیونکہ وہ اس

وقت خالی ہاتھ تھے۔

”تم لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہو گے۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”میری عادتوں سے

بھی واقف ہو گے۔ نہ واقف ہو تو سنو! میری ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی بعض اوقات رکتا نہیں جانتی۔“

وہ کچھ نہیں بولے۔ چپ چاپ ہاتھ اٹھائے کھڑے رہے۔ اتنی دیر میں حمید قاسم کو بھی

کھول چکا تھا اور قاسم ان پانچوں کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

”فریدی صاحب! کیا میں ان سالوں کو سنبھال لوں۔“ قاسم نے پوچھا۔

”نہیں.....!“ فریدی نے جواب دیا۔ پھر حمید سے بولا۔ ”انکی جیبوں سے ریوالور نکال لو۔“
حمید نے بڑی تیزی سے ان کی جامہ تلاشی لے کر پانچ ریوالور برآمد کر لئے پھر وہ فریدی کا اشارہ پا کر ہارڈی کو بھی ٹٹولنے لگا لیکن اُس کے پاس سے ایک بڑے چاقو کے علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔ اب فریدی نے ان پانچوں کو مخاطب کر کے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”ہارڈی کو مارو۔“

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ ہارڈی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

”دوسری صورت میں تم ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤ گے ہارڈی۔ فریدی حفاظت خود اختیاری کے سلسلے میں ایک نہیں دس آدمیوں کو جان سے مار سکتا ہے اور میں تم لوگوں کو بھی کہتا ہوں کہ میرے حکم کے خلاف تمہارا ایک قدم بھی تمہیں موت ہی کی طرف لے جائے گا۔ چلو مارو..... ہارڈی کو۔ نہیں قاسم! تم صرف دیکھو گے۔ پیچھے ہٹو۔“

قاسم برا سامنہ بنائے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

وہ لوگ ہارڈی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن انداز سے ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس پر ہاتھ اٹھانے کی بھی جرأت کر سکیں گے۔

”اچھا تو پھر تم ہی ان لوگوں کو مارو۔“ فریدی بولا لیکن اس کی سنجیدگی میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”آخر آپ کی فضاء کیا ہے۔“

”کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ میں عام فہم زبان میں گفتگو کر رہا ہوں۔ خیر چلو تمہاری خاطر ایک بار پھر دہرا دوں۔ کم سے کم الفاظ میں۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو تم ان لوگوں کے ہاتھوں پٹو یا انہیں پٹو۔“

”میں پیٹ دوں سب سالوں کو۔“ قاسم نے لجاجت آمیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں! میں نہیں چاہتا کہ ہارڈی جیسے ذلیل احسان فراموش کتے کو کوئی شریف آدمی

ہاتھ بھی لگائے۔“

اُس نے ان پانچوں آدمیوں کو پھر ٹوکا اور ساتھ ہی اُس کے ریوالور سے ایک شعلہ بھی نکلا۔ ان میں سے ایک کی فلٹ ہیٹ اڑ گئی اور وہ بدحواسی میں اچھل کر ہارڈی پر جا پڑا۔ ہارڈی نے اُسے فریدی کی طرف دھکیل دیا۔ فریدی سو نہیں رہا تھا۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر ایک لات اُسے رسید کر دی اور وہ پھر ہارڈی ہی پر جا گرا۔ لیکن اس بار اُس نے ہارڈی کی گردن پکڑ لی اور ہارڈی نے اس کے جڑے پر دو تین کتے رسید کر دیئے بس پھر کیا تھا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ وہ چاروں بھی ہارڈی پر پل پڑے۔

حمید فریدی کی اس حرکت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک بالکل ہی انوکھا خیال تھا یعنی فریدی ہارڈی کو ان لوگوں سے پتو رہا تھا جن کی اس نے مدد کی تھی۔ ہارڈی کے لئے اس سے زیادہ تلخ تجربہ اور کیا ہوتا۔ وہ غصے سے آگ ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کا لباس تار تار ہو گیا۔ ویسے وہ کسی وحشی درندے کی طرح اُن لوگوں سے نپٹ رہا تھا۔ اُن لوگوں کے انداز سے بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اُسے ختم ہی کر کے دم لیں گے۔ اُن کے چہرے لہو لہان تھے اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔

ہارڈی، ہارڈی ہی تھا۔ پانچ کیا اگر دس بھی ہوتے تو وہ خود پر انہیں قابو نہ پانے دیتا۔
”آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا۔“ حمید نے فریدی کے قریب آ کر آہستہ سے پوچھا۔
”پرواہ مت کرو۔ کیا یہ کھیل دلچسپ نہیں ہے۔“

حمید خاموش ہو گیا۔ ہارڈی اب تک دو آدمیوں کو گرا چکا تھا اور وہ بیہوش پڑے تھے پھر تیسرے کا اضافہ ہو گیا اور باقی بچے ہوئے آدمی ہارڈی کو گرا دینے کے لئے اپنی رہی سہی طاقت صرف کرنے لگے۔

باہر تاریکی اور سناٹے کی حکمرانی تھی اور یہاں اس کمرے میں موت و حیات کی کشمکش جاری تھی۔ ایک بار ان دونوں نے ہارڈی کو گرا ہی لیا لیکن شاید اب ان میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکتے۔ ہارڈی کے ساتھ ہی وہ دونوں بھی اُسی پر ڈھیر ہو گئے۔ تینوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے لیکن پورے جسم میں صرف آنکھیں ہی حرکت کر رہی تھیں۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ پتہ نہیں وہ خود اس وقت ذہنی حالت

قاسم کچھ نہ بولا۔ فریدی چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر وہ سڑک کی طرف چلنے لگا۔ قاسم کھانسا نکلتا ہوا اُس کے ساتھ چل رہا تھا۔ کئی بار جھاڑیوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچا۔ حمید کار میت سڑک پر اُن کا منتظر تھا۔

”تم ہی کارڈ رائیو کرو گے۔“ فریدی نے اس سے کہا۔ پھر قاسم سے بلند آواز میں بولا۔

”تم بھی آگے ہی بیٹھو۔ میں پچھلی سیٹ پر تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔“

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ قاسم پہلے ہی حمید کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ کار چل پڑی۔ حمید کا ذہن بڑی طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی دانست میں ابھی تک فریدی کی ساری حرکتیں ہوشمندی کے معانی رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اس طرح آپس میں لڑانا۔ پھر انہیں اُس حال میں وہیں چھوڑ کر چلے آنا۔ اس قسم کی حرکتیں کسی ہوشمند آدمی سے نہیں سرزد ہو سکتیں۔ آخر فریدی کیا کرنا چاہتا ہے۔ حمید سوچتا رہا لیکن فریدی بے پوچھنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فریدی کچھ نہ بتائے گا۔ پھر وہ قاسم سے پوچھنے لگا کہ وہ وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔ قاسم نے بڑی مشکل سے پورا واقعہ دہرایا۔ وہ دراصل اس موضوع ہی کو نال جانا چاہتا تھا۔

”تم کسی دن لڑکیوں کے چکر میں اپنی مولیٰ سی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔“ حمید بولا۔

”یہی فریدی صاحب نے بھی کہا تھا۔“ قاسم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے..... مگر میں بالکل چنبد ہو جاتا ہوں۔“

”چنبد نہیں بھینس۔ چنبد تو ایک چھوٹے سے پرندے کو کہتے ہیں۔“

”تم خود بھینس۔!“ قاسم جھنجھلا گیا۔ ”ہاں نہیں تو۔“

پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ کار جنگل کے سناٹے میں دوڑتی رہی۔ حمید کا ذہن پھر کچھ دیر قبل پیش آئے ہوئے واقعات میں الجھ گیا۔ پی سنگ اور ہارڈی کا باہمی تعاون اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جب کہ دونوں آپس ہی میں لڑنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ آخر پی سنگ کو پریشانی کیوں تھی؟ وہ کیوں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ فریدی نے اس کے پیچھے اپنے آدمی کس مقصد سے لگا رکھے ہیں..... پھر وہ لڑکیوں کے اس عجیب و غریب مرض کے متعلق سوچنے لگا۔ کیا فریدی کی دانست میں اس کا پی سنگ سے بھی کوئی تعلق ہے؟ مگر کیا؟ اگر

کے کس اسٹیج سے گزر رہے تھے۔ حمید کو تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ تین بے بس پرندے ہوں جن کے سارے پر کسی شریر بچے نے نوچ کر سکنے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔

اُس نے فریدی کی طرف دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ اسے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو عموماً شریر ہی بچوں کے ہونٹوں پر نظر آتی ہے۔

”آؤ! واپس چلیں۔“ فریدی نے حمید اور قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اور..... یہ!“ حمید نے زخمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”انہیں یہیں مرنے دو۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

قاسم اور حمید بھی باہر آئے۔ حمید نے مڑ کر اُس عمارت کی طرف دیکھا۔ یہ مٹی سے بنی تھی۔ اندھیرے میں بھی اس کا بیڑھنگا پن محسوس کیا جاسکتا تھا۔ چاروں طرف درختوں اور جھاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ دونوں خاموشی سے فریدی کے پیچھے چلتے رہے۔ ایک جگہ رک کر فریدی نے بائیں روشن کی اور پھر چلے لگا۔ جھاڑیوں میں فریدی کی چھوٹی سی آسنٹن کار موجود تھی۔

”اُسے سڑک پر لے چلو۔“ اس نے حمید سے کہا۔ ”آگے چل کر جہاں جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے وہاں ہی طرف مڑ جانا۔“

”یہاں کسی عورت کی چٹھیں.....!“

”ہاں! چلو اپنا کام کرو۔ وہ میری روح چیخ رہی تھی تمہارے لئے۔“

حمید کار میں بیٹھ کر اُسے اشارت کرنے لگا اور فریدی نے قاسم سے پوچھا۔ ”تم کہاں آ پھنپے تھے۔“

”جی ہاں..... وہ..... بس پھنس گیا۔“

”کوئی لڑکی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”لل..... ہی..... ہی..... ہی..... نہ نہیں تو.....!“

”تم دونوں کسی دن لڑکیوں ہی کے چکر میں ختم کر دیے جاؤ گے۔“

کچھ لڑکیاں پاگل ہو کر دوسروں کو مار بیٹھتی ہیں تو اس سے پی سنگ یا کسی دوسرے آدمی کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

”میرا گھر راستے ہی میں پڑتا ہے حمید بھائی۔“ دفعتاً قاسم بڑبڑایا۔

”پھنا ہوا سر لے کر گھر جاؤ گے۔ اگر بیوی پوچھ بیٹھی تو۔“

”لغت ہے سالی پر..... اسی کی بدولت تو.....!“ قاسم جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

”جھک مارتے ہو۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔“ حمید نے کہا۔ ”تم جھوٹے ہو۔“

”تمہاری کون لگتی ہے..... کیوں؟“ قاسم جھنجھلا گیا۔

”خواہ مخواہ پیاری کو بدنام کرتے پھرتے ہو۔“

”اچھا بس خاموش رہو، ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔ تم کیا جانو اسے۔ ابھی پرسوں ہی اپنی

خالہ سے کہہ رہی تھی کہ میں بالکل گدھا ہوں۔ میں نے چھپ کر سنا تھا۔ پھر مجھے غصہ آ گیا۔

میں دھڑ دھڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا اور کہا کہ وہ ثابت کرے۔ کیا کرتی پیاری اپنا سامنے لے

کر رہ گئی۔ میں نے ڈانٹ پلائی تو کہنے لگیں میں جو چاہا جان کو پھون کر دوں گی۔“

بیوی کے لہجے کی نقل اتارنے کے سلسلے میں قاسم بڑی دیر تک چلکنا رہا۔

”تو وہ تمہیں گدھا ثابت نہیں کر سکی۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس کا باپ بھی نہیں کر سکتا۔“

”اس کا باپ تمہارا چچا ہے۔“

”ہوگا سالا! تم طرفداری نہ کیا کرو ان لوگوں کی سمجھ!“ قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

کچھ دیر خاموش رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر دردناک آواز میں بولا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں

کس طرح اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ تم کبھی نہ سمجھو گے۔ اگر معصیٰ کرنے کی عادت نہ ہوتی تو

میں کبھی کامر گیا ہوتا۔ اسی میں اپنا دماغ الجھائے رکھتا ہوں۔ بچھلی بار میرا پہلا انعام آ گیا ہوتا

مگر سالے نے لنگور کی بجائے انگوڑے دے دیا۔ اچھا یہ بتاؤ اگر عورت بیوی یا بیوہ ہو جائے تو اسے

پڑوسن کے شوہر سے بچ کر رہنا چاہئے۔ بولو..... بیوی ہوگا بیوہ۔“

”مجھے معمول سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

”اچھا یہ بتا دو..... سمندر یا مجھندر کے سینے سب رازوں کا پالینا بہت مشکل ہے۔ سمندر

ہوگا یا مجھندر..... اوپر سے نیچے سر پٹ یا مرگٹ بنتا ہے۔“

”مت بکواس کرو۔“

”اچھا فریدی صاحب..... آپ بتا دیجئے۔“ قاسم بچھلی سیٹ کی طرف مڑا۔

”ہائیں.....!“ وہ ہاتھ بڑھا کر بچھلی سیٹ کو ٹوٹا ہوا بولا۔ ”ارے باپ رے۔“

”کیا ہوا.....؟“ حمید نے مڑے بغیر پوچھا۔

”نف..... ری..... دی..... صص..... صاحب۔“

دوسرے ہی لمحے میں حمید نے رفتار کم کر کے کار روک دی۔ قاسم کا لہجہ نہ جانے کیا کہہ رہا

تھا۔ بچھلی سیٹ خالی تھی۔ حمید نے اندر روشنی کر دی اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

”کوئی اٹھالے گیا۔“ قاسم نے پوچھا۔ ”وہ تو سو رہے تھے۔“

حمید کچھ نہیں بولا۔ تھوڑی دیر تک بڑا سامنے بنائے بیٹھا رہا پھر کار اسٹارٹ کر دی۔

”ہائیں..... تلاش نہیں کرو گے۔“ قاسم نے کہا۔

”بیٹھے رہو، چپ چاپ۔“ حمید جھنجھلا گیا۔ قاسم خاموش ہو گیا۔ اس کے سر میں تکلیف

تھی اس لئے یوں بھی اب وہ خاموش ہی رہنا چاہتا تھا۔ ابھی تک زخم کھلا ہوا تھا۔ حمید نے قاسم

کو آ لکچھو کے پھانک پر چھوڑ کر گھر کی راہ لی۔ قاسم پہلے تو گھر ہی جانا چاہتا تھا لیکن پھر اسے یاد

آ گیا تھا کہ اس کی کار آ لکچھو کے کمپاؤنڈ ہی میں رہ گئی تھی۔ انڈیشین لڑکی کے ساتھ جاتے

وقت وہ اپنی کار وہیں چھوڑ گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بوکھلاہٹ میں اسے پادی نہیں آیا تھا کہ

یہیں اس کی کار بھی موجود ہے۔ بہر حال وہ اس کے ساتھ ٹیکسی میں گیا تھا۔

حمید نے گھر آ کر سونا چاہا لیکن نیند نہ آئی۔ باورچی کو جگا کر کافی کے لئے کہا۔ نوکروں

کے معاملے میں وہ فریدی سے بہت مختلف تھا۔ فریدی کبھی کسی نوکر کو ناوقت جگانا نہیں تھا۔ اگر

کبھی رات گئے کافی کی خواہش ہوتی تو خود ہی کچن میں جا گھستا۔

کافی پینے کے بعد بھی اسے نیند نہ آ سکی۔ پھر شاید چار بجے اس کی آنکھ لگ گئی۔ ظاہر

ہے کہ ایسی صورت میں وہ گھوڑے سے بچ کر سویا ہوگا۔

پھر نیند کیسے اچٹ گئی۔ یہ بات تھوڑی دیر تک سمجھ میں آئی نہ سکی۔ ویسے فون کی گھنٹی تو بہت دیر سے بج رہی تھی۔

”ہیلو.....!“ حمید مسہری سے چھلانگ لگا کر دہانزا۔ پھر ریسور اٹھا کر ماوتھ پیس میں بولا۔ ”کون ہے..... کیا بات ہے..... رات کو بھی۔“

لیکن اچانک وہ خاموش ہو گیا کیونکہ روشندان میں دھوپ نظر آ رہی تھی۔

”میں قدیر ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”دولت گنج تھانے سے بول رہا ہوں۔

یہاں ایک ایسی لڑکی موجود ہے جس نے ایک ٹریفک کانٹیل کو مارا پیٹا ہے۔“

”کانٹیل زندہ ہے یا مر گیا۔“ حمید نے جھلا کر کہا۔

”کون صاحب بول رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں بول رہا ہوں۔“

”کپتان صاحب۔“

”ارے ہاں ہاں۔“

”تو بس آجائیے۔ کیا آپ نے نہیں پہچانا..... میں قدیر ہوں۔“

”آہا..... قدیر صاحب..... اچھا..... اچھا..... میں آدھے گھنٹے تک پہنچ سکوں گا۔“

حمید نے ریسور رکھ دیا۔ گھڑی ساڑھے دس بج رہی تھی۔ سب سے پہلے اُس نے فریدی

کے متعلق معلوم کیا جو پچھلی رات سے اب تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ پھر دولت گنج جانے کی تیاری کرنے لگا۔

شہر کے سارے تھانوں کے لئے فریدی کے خاص احکامات تھے کہ جب بھی کوئی اس قسم کی لڑکی آئے اُسے یا حمید کو براہ راست مطلع کیا جائے۔

قدیر دولت گنج کے تھانے کا انچارج تھا۔ حمید نے اُسے اپنا منتظر پایا۔

”یہ کیا مصیبت ہے جناب۔“ قدیر نے کہا۔ ”اپنے یہاں یہ پہلا ہی کیس آیا ہے۔“

”اور بھی آئیں گے مطمئن رہئے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”لڑکی کہاں ہے۔“

”زنانہ حوالات میں..... مجھے اس پر بہت ترس آ رہا ہے۔ کسی اچھے خاندان کی لڑکی

معلوم ہوتی ہے۔ آپ اُسے دیکھ کر یہ کہہ ہی نہیں سکتے کہ اس نے کانٹیل پر حملہ کیا ہوگا۔“

”پھر اُسے روک کیوں رکھا ہے۔“

”اس نے حملہ کیا تھا۔“ قدیر نے کہا۔ ”کانٹیل نے اُسے سڑک پار کرنے سے روکا تھا۔

بس وہ اُس پر ٹوٹ پڑی اس کا چہرہ فوج ڈالا۔ دانتوں سے وردی کی دھجیاں اڑا دیں۔“

”آہا تب تو آپ بھی بہت زیادہ خائف رہے ہوں گے۔“

”اب تو بھیگی ملی بن گئی ہے۔ کچھ دیر تک روتی بھی رہی تھی۔ البتہ اپنا نام اور پتہ بتانے

پر کسی طرح تیار نہیں ہوتی۔“

”اچھا میں دیکھتا ہوں۔“ حمید نے کہا اور زنانہ حوالات کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلاخوں کے پیچھے لڑکی موجود تھی، لیکن حمید اس کی شکل نہیں دیکھ سکا، کیونکہ وہ گھٹنوں میں

سر دیئے بیٹھی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے حمید کی آہٹ پر سر اٹھایا حمید کی آنکھوں میں بجلی سی

چمک گئی۔ پہلی نظر میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔ دوسری نظر بھی تفصیلی جائزے

کیلئے کافی تھی اور تیسری نظر کو اتنا ہوش کہاں کہ وہ تفصیل میں جاسکتی۔ حمید اسکی اداس آنکھوں

میں کھو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی سنسان مقام پر کھڑا ہو۔ خاموشی سے پرواز

کرنوالے پرندوں کی قطاریں افق کی سرخی میں لہر رہی ہوں اور کسی پرسکون جھیل میں افق کے

رنگین لہریئے آنکھ بچوٹی کھیل رہے ہوں۔ لیکن ان سب پر ایک خوب آگین سی اداسی بھی مسلط ہو۔

حمید کے اشارے پر سلاخوں دار دروازہ کھول دیا گیا۔ لڑکی زمین سے اٹھ گئی تھی۔ اُس

نے حمید کو نیچے سے اوپر تک دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”باہر آئیے۔“ حمید نے نرم لہجے میں کہا اور وہ چپ چاپ سلاخوں کے باہر چلی آئی۔

”آپ جہاں جانا چاہتی ہوں چلی جائیے۔ آپ سے کوئی کچھ نہیں پوچھے گا۔“

وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”شکریہ۔“

حمید باہر جانے کے راستہ میں آیا جہاں انسپکٹر قدیر بیٹھا ہوا تھا۔

”وہ صدر دروازے سے نکل گئی ہے۔“ حمید نے اُس سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ایک

سادہ لباس والا اس کا تعاقب کرے..... جلدی کرو۔“

”زمانہ فورس کی کسی لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے جسے اُس نے دیکھا نہ ہو۔“ قدیر نے پوچھا۔
 ”بہت اچھا خیال ہے..... یہ اور بھی اچھا رہے گا مگر جلدی کیجئے۔“ حمید نے مضطرب انداز میں کہا۔

حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ایسی لڑکیوں کے خلاف سخت قسم کے اقدامات ممکن نہیں تھے۔ عام آدمی اسے کوئی دہائی ذہنی مرض سمجھتے تھے۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ کسی مستقل مرض کا نشان تک موجود نہیں ہے ان کی دانست میں وہ ایک وقتی ذہنی تبدیلی تھی جس کی وجہ جذباتی الجھاؤ بھی ہو سکتا تھا اور اعصابی اختلال بھی۔ لیکن اعصابی اختلال کی شکار لڑکیاں بمشکل تمام دو فیصدی مل سکتی تھیں۔ ابھی تک جتنے بھی کیس ڈاکٹروں کے علم میں لائے گئے تھے۔ ان میں قریب قریب ساری ہی لڑکیاں صحت مند اور صحیح الدماغ تھیں۔ اعصابی کمزوری کے آثار بھی نہیں ملے تھے۔ محکمہ سراغ رسانی اس سلسلے میں کسی جرم کے امکانات پر غور کر رہا تھا بہر حال کئی طرح کی آرائیں موجود تھیں اس لئے فی الحال ایسی لڑکیوں کو زیادہ تر سرکاری اصلاح خانوں میں بھیج دیا جاتا تھا اور ان کے رویہ کی یومیہ رپورٹ محکمہ سراغ رسانی کو ملتی رہتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل ”محکمہ سراغ رسانی“ صرف فریدی کی میز پر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا..... اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیونکہ یہ فریدی ہی کی آج تھی، ورنہ بات کسی دہائی ذہنی مرض پر ٹل گئی ہوتی۔

حمید دولت گنج کے تھانے سے سیدھا آفس پہنچا۔ فریدی یہاں بھی موجود نہیں تھا لیکن اس کی میز پر اصلاح خانوں کی رپورٹوں کے ڈھیر نظر آرہے تھے۔ حمید بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان رپورٹوں میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کسی لڑکی پر بھی ابھی تک کسی اصلاح خانے میں اس قسم کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ حمید کچھل رپورٹیں بھی دیکھتا رہا تھا لیکن ایک بھی مثال ایسی نہ مل سکی کہ اصلاح خانوں میں کسی لڑکی کی معمول کی ذہنی حالت میں کوئی تغیر واقع ہوا ہو۔ وہ بڑی دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ ایسی لڑکیوں میں سے ابھی تک صرف تین لڑکیاں اصلاح خانوں میں نہیں بھیجی گئی تھیں۔ دو کو تو فریدی ہی نے چھوڑ دیا تھا۔ روجی اور سائرہ جنہیں سٹی مجسٹریٹ کی سفارش پر چھوڑا گیا تھا اور تیسری آج حمید کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ سائرہ اور روجی کی رہائی کے لئے فریدی نے یہ جواز پیش کیا تھا کہ وہ ان کے ذریعہ بہت کچھ معلوم کر سکے گا لیکن حمید کے

پس اس لڑکی کو چھوڑ دینے کے لئے کوئی بہانہ نہیں تھا۔ وہ تو بس اس سے متاثر ہوا تھا اور اس بچہ کو تھوڑی دیر کے لئے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی رخصت ہو گئی تھی اور وہ تعاقب والا معاملہ تو کس دکھاوا تھا۔ آخر قدیر اور دوسرے لوگوں کو بھی تو مطمئن کرنا ہی تھا۔

وہ لڑکی ایسی ہی تھی، جو اسے صحیح معنوں میں عورت معلوم ہوئی تھی اور اُس سے نظر ملتے ہی وہ بوکلا گیا تھا۔ شاید برسوں کے بعد ایسی لڑکی ملی تھی۔ ویسے تو روز ہی ایک آدمی سے سابقہ رہتا تھا لیکن حمید کا خیال تھا کہ وہ لڑکیاں نہیں بلکہ ”لوٹے“ ہوا کرتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اُس کے دوسرے مرد دوست تھے۔ اُن لڑکیوں میں عورت پن نام کو بھی نہ ہوتا۔ ان میں ایک چیز بھی ایسی نظر نہ آتی جس کی بناء پر انہیں جنس مقابل کی صف میں جگہ دی جاسکتی۔ بعض اوقات تو وہ حمید کو سو فیصدی ”بیجوئے“ معلوم ہوتیں۔ بہر حال وہ انہیں عورتیں نہیں سمجھتا تھا۔

چھلانگ

وہ فائلیں التنا رہا اور اس کے ذہن پر وہی لڑکی مسلط رہی۔ اچانک اُس کی نظر رمیش کے ڈیسک کی طرف اٹھ گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سوتے سوتے جاگ پڑا ہو۔ اُسے ابھی تک رمیش کے متعلق نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ اُس نے فائل رکھ کر فون کا ریسور اٹھایا اور رسول ہسپتال کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

وہاں سے اطمینان بخش اطلاع ملی۔ رمیش اب ہوش میں تھا۔ لیکن احتیاطاً ابھی اُس سے کسی کو گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

حمید ریسور رکھ کر پھر فائل اٹھنے لگا۔ اس پر پھر اکتاہٹ کا حملہ ہونے لگا تھا وہاں سے اٹھنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ حمید نے ریسور اٹھالیا۔

”ہیلو.....!“

”کرل صاحب۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”نہیں میں حمید ہوں۔“

فارمولے کا علم نہیں تھا۔ ملزمہ تعلیم یافتہ ہے۔ بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری رکھتی ہے۔ بنگالی ہونے کے باوجود بھی اردو پر اسے قدرت حاصل ہے۔ زیادہ تر غرارے اور ڈوپٹے میں رہتی ہے۔ عموماً یہی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ بنگالی نہیں ہے۔“

فائل کو بند کر کے اس نے پاپ سلگایا اور اس طرح غدا حال ہو کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا جیسے بہت تھک گیا ہو۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے انکشاف پر وہ شدت سے بور ہو گیا تھا۔ اس نے دو چار لمبے لمبے کش لئے اور پھر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

اب وہ اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں لیڈی انسپکٹر مس ریکھا بیٹھا کرتی تھی۔ وہ حمید کو اپنے کمرے میں دیکھ کر بوکھلا گئی کیونکہ عموماً وہ اس سے دور ہی دور رہا کرتی تھی۔

”میں تمہیں تھوڑی سی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔“ حمید نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”کیا بات ہے کہنے!“

”راگ محل میں اس وقت ایک ملزمہ موجود ہے۔ فی الحال زنانہ فورس کی ایک لڑکی مس رانا اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر نظر رکھو۔“

”رانا کو میں جانتی ہوں۔ کیا یہ کوئی اہم معاملہ ہے۔“

”اس کا علم صرف فریدی صاحب کو ہی ہو سکتا ہے۔ ویسے وہ بہت چالاک ہے، ورنہ میں خود ہی اس کی نگرانی کرتا۔“

”وہ ملزمہ ہے کون؟“

”سرلا کمر جی..... ڈاکٹر زیدی کی لیبارٹری اسٹنٹ۔“

”آہ..... اور آپ اسے اپنا کام کہہ رہے ہیں حالانکہ یہ کیس اب بھی میرے ہی پاس ہے مگر آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔“

”نہیں میں سنجیدہ ہوں۔“

”اچھا تو پھر میں جاری ہوں لیکن اگر وہ سرلانہ ہوئی تو میں آپ سے سمجھ لوں گی۔“

”میں سمجھا دوں گا..... فی الحال تم جاؤ۔“

”سرلا تو بڑی حسین عورت ہے۔ تعجب ہے کہ آپ اپنی جگہ مجھے بھیج رہے ہیں، اسی لئے

”اوہ..... میں قدر بول رہا ہوں۔ دیکھئے..... ابھی مس رانا نے فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ لڑکی راگ محل میں گئی ہے اور اس وقت بھی وہیں ہے اور دوسری بات بھی سنئے۔ مجھے اس کا چہرہ پہلے ہی سے کچھ جانا پہچانا سا معلوم ہوا تھا۔ کیا آپ کو علم ہے کہ وہ سرلا ہے۔“

”کیا بے سرو پا باتیں کر رہے ہیں آپ۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔

”بے سرو پا نہیں جناب..... آج سے چھ ماہ قبل آپ ہی کے آفس سے اس عورت کا جلد جاری ہوا تھا۔ اسکی ایک کاپی مع تصویر میرے فائل میں بھی موجود ہے۔ آپ اپنے یہاں کے فائلوں میں دیکھئے میرے بیان کی تصدیق ہو جائیگی۔ حوالہ نمبر ای تھری اپان فنی تھری ہے۔“

”اچھا اچھا..... میں دیکھتا ہوں۔ آپ زنانہ فورس والی لڑکی سے کہہ دیجئے کہ اس پر برابر نظر رکھے..... یا ظہریئے! میں یہاں سے کسی کو اس کی مدد کے لئے بھیجے دیتا ہوں۔ بہر حال اسے نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ کیا نمبر بتایا تھا آپ نے۔“

”ای تھری اپان فنی تھری۔“

حمید نے پنسل اٹھا کر میز پر نمبر لکھا اور ریسیور رکھ کر فنی تھری کا فائل تلاش کرنے لگا۔ فائل جلد ہی مل گیا کیونکہ فریدی کے کاغذات کبھی بے ترتیبی سے نہیں رکھے جاتے تھے۔ تیسرے ہی صفحے پر وہ نمبر مل گیا جس کا تذکرہ قدیر نے کیا تھا اور اس پر لگی ہوئی تصویر۔ حمید کا سر چکر ا گیا۔ وہ سو فیصدی وہی لڑکی تھی جسے حمید نے چند گھنٹے پیشتر حوالات سے نجات دلائی تھی۔

حمید نے فائل بند کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اس طرح اپنے سر کو جھٹکے دینے لگا جیسے کسی ہتکے ہوئے خیال کو اس کی صبح جگہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔

کچھ دیر بعد اس نے پھر فائل کھولا اور تصویر کے نیچے والی عبارت پڑھنے لگا۔

”سرلا کمر جی..... عمر تیس سال لیکن حیرت انگیز طور پر کسن معلوم ہوتی ہے۔ عموماً یہی گمان ہوتا ہے کہ وہ انیس یا بیس سے زیادہ نہیں ہے۔ ۱۳ جون ۵۵ء تک ماہر نباتات ڈاکٹر اے ایچ زیدی کی لیبارٹری میں بحیثیت اسٹنٹ کام کرتی رہی۔ ۱۳ جون کی شب ڈاکٹر زیدی کو پانی میں بیہوشی کی دوا دے کر ان کا کوئی بیش قیمت فارمولا چرائے گئی۔ وہ فارمولا زیر تجربہ تھا۔ ڈاکٹر زیدی اس پر بہت احتیاط سے تجربہ کر رہے تھے اور ان کے کسی بھی اسٹنٹ کو

یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

”وہ تم سے زیادہ حسین نہیں۔“ حمید نے عادت کے مطابق ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
رکھا جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی، لیکن شاید اب بھی اُسے حمید کے بیان میں شرب تھا۔
”مگر دیکھو“ حمید نے کہا۔ ”تم صرف نگرانی کرو گی۔ اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر بیٹھنا۔“
”کیوں؟“

”شاید فریدی صاحب کو کسی دوسرے معاملے میں بھی اس کی ضرورت ہے۔ تم فون پر حالات سے آگاہ کرتی رہنا۔“

رکھا چلی گئی اور حمید پھر اپنے کمرے کی طرف واپس آیا لیکن دروازے ہی پر اُس نے محسوس کر لیا کہ فریدی واپس آ گیا ہے۔ اس کا قیاس غلط نہیں تھا۔ فریدی وہاں موجود تھا اور اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے، جو حمید کو دیکھتے ہی اور زیادہ گہرے ہو گئے۔

”یہ فائل کس نے بکھیرے ہیں۔“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔
”میں نے۔“ حمید خجیدگی سے بولا۔ ”اور میں ان میں میر تقی میر کی کوئی غزل تلاش نہیں کر رہا تھا۔ آپ یقین کیجئے۔ ویسے میرے پاس آپ کے لئے ایک بڑی شاندار اطلاع ہے۔“
”بکو۔۔۔!“

”نہیں۔ وہ اطلاع اسی صورت میں آپ تک پہنچ سکتی ہے جب آپ مجھے ہارڈی وغیرہ کے حشر سے آگاہ کر دیں۔“

”او۔۔۔۔۔!“ فریدی کے ہونٹوں پر ایک پھسکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہ بولا۔
”پچھلی رات میں نے بہت بُری طرح وقت برباد کیا ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ میں تو سمجھا تھا شاید آپ بھی ہوش میں نہیں ہیں۔“
”چلو یہی سمجھ لو۔۔۔۔۔ مگر اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ بعض اوقات مجھ سے بھی پچھنا سرزد ہو جایا کرتا ہے۔“

”شرط پوری کئے بغیر آپ اُس نئی اطلاع سے محروم ہو جائیں گے۔“
”چلو۔۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ فریدی بے دلی سے بولا۔

”ہارڈی وغیرہ کے خلاف آپ نے جو رویہ اختیار کیا تھا۔“

”وہ رویہ اپنی جگہ پر بالکل درست تھا اور اس کے لئے میں کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ ہارڈی اسی قابل ہے کہ اسے گھٹیا سے گھٹیا آدمیوں سے پتوایا جائے۔ وہ خود کو بندرگاہ کے دانے کا سب سے بڑا غنڈہ سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پانچوں آدمی اس سے کبھی آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہ کر سکتے۔ یہ صدمہ ہارڈی کے لئے بڑا جان لیوا ثابت ہوگا۔“

”لیکن آپ سے پچھنا کون سا سرزد ہوا۔“

”یہ خام خیالی ہے کہ پی سنگ ان کی خبر لینے کے لئے دوبارہ وہاں آئے گا۔ یہی سوچ کر میں نے ساری رات جھگل میں گزار دی۔ تمہیں کار میں دھوکہ دیا۔ خیال یہ تھا کہ پی سنگ وہیں کہیں چھپا ہوگا۔ لہذا اسے دھوکہ میں رکھنے کے لئے مجھے کار والی حرکت کرنی پڑی۔ ویسے مجھے افسوس ہے کہ پچھلی رات تمہیں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑی تھیں۔“

”تو کیا آپ نے انہیں یونہی چھوڑ دیا۔“

”نہیں اب وہ حوالات میں ہیں۔“

”آ خر آپ پی سنگ کے چکر میں کیوں ہیں۔“

”آ خر اُسے اتنی فکر کیوں ہے کہ میں اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ یقیناً وہ کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہوگا جس کے لئے اُس نے حکمہ سراخ رسانی کے ایک آفیسر کو پکڑوا کر اذیت دینے کی کوشش کی تھی۔ پی سنگ کی نگرانی میرے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ تقریباً ایک سال سے میرے آدمی اس کے پیچھے ہیں۔“

”آ خر کس لئے۔“

”آ خر کا دورہ پڑ گیا ہے تم پر۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔ شہر کے مارے مجرم جن کے خلاف میں کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچا پا تا میری نگرانی میں رہتے ہیں۔ ان میں سے بہترے اس سے واقف بھی ہیں لیکن آج تک کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ میرے کسی آدمی پر ہاتھ ڈال سکے۔“

”تو پی سنگ اب روپوش ہو گیا۔“

راگ محل

فریدی کی یہ چھلانگ..... حمید نے سوچا کہ نتائج کے لحاظ سے یقیناً بہت سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ مگر شام تک اُسے کوئی سنسنی خیز اطلاع نہ مل سکی۔ تقریباً چھ بجے فریدی واپس آیا لیکن اسکے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھ کر حمید کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ ابھی کامیابی کو سوں دور ہے۔ حمید نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ مگر شاید فریدی خود ہی کچھ بتانا چاہتا تھا۔

”راگ محل بڑی اچھی جگہ ہے حمید“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تم شاید وہاں کبھی نہ گئے ہو گے کیونکہ داخلہ صرف ممبروں کا ہی ہو سکتا ہے یا پھر وہاں لوگ مہمانوں کی حیثیت سے جاتے ہیں اس کے لئے بھی کم از کم تین پرانے ممبروں کی سفارش ضروری ہوتی ہے۔ شہر کے بہت بڑے بڑے آدمی اُس کے ممبر ہیں۔“

”ہاں میں نے اس کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”شاید وہ مختلف قسم کے آرٹسٹوں کا کوئی ادارہ ہے۔ وہاں راگ رنگ کی محفلیں زیادہ ہوا کرتی ہیں۔“

”ارے پرستان ہے..... پرستان۔“ فریدی مسکرا کر آہستہ سے بولا۔ لیکن اس کا یہ لہجہ حمید کیلئے بالکل نیا تھا۔ بالکل اوباش آدمیوں کا سالہجہ۔ وہ متحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم آج کل بہت اداس ہو۔“ اس نے پھر کہا۔ ”کیا تم نے کبھی راگ محل کے پبلک جلسوں میں بھی شرکت نہیں کی۔“

”مجھے کچے گانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ویسے جب کبھی سننے کو دل چاہتا ہے اپنے بکرے کو دو چار ڈنڈے لگا دیتا ہوں۔“

”حمید تم وہاں ضرور جاؤ۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بلکہ اگر مستقل ممبر ہی بن جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔“

”میں سمجھا۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”مگر میری سفارش کون کرے گا۔“

”قطعی جی بات ہے۔“

حمید نے پھر کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”بس! ہاں تم مجھے کیا بتانے والے تھے۔“

”آج صبح ایک خوبصورت سی لڑکی دولت گنج کی حوالات میں تھی۔ مجھے وہ اتنی اچھی لگی کہ میں نے اُسے رہا کر دیا۔“

”کیوں.....؟“

”آپ نے اُن دونوں کو کیوں چھوڑ دیا تھا۔ آپ دو کو چھوڑ دیں اور میں ایک کو بھی چھوڑ دینے کا حق نہیں رکھتا۔ ہائے وہ کتنی حسین تھی۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

چند لمبے خاموش رہا اور پھر فریدی کی غصیلی آنکھوں کی پرواہ کئے بغیر بولا۔ ”میرے پاس اس کی تصویر بھی موجود ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ فریدی نے کہا اور اس کی بکواس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اصلاح خانوں کی رپورٹیں دیکھنے لگا۔

حمید نے ففٹی تھری کا فائیل کھول کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بھی دیکھ لیجئے۔“

فریدی کی نظر سرلا کی تصویر پر پڑی اور وہ چونک پڑا۔ ”کیا مطلب!“

”وہ یہی تھی لیکن نکل گئی۔“

”گدھے!“ فریدی دہاڑا۔

”گدھے تو موجود ہیں لیکن وہ نکل گئی۔“ حمید نے بڑی معصومیت سے کہا۔

”نہیں تم بکواس کر رہے ہو۔“ فریدی کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ نظر آئی جس میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔ اس کے بعد ہی حمید نے گراموفون کے ریکارڈ کی طرح بولنا شروع کر دیا اور پھر جیسے ہی راگ محل کا نام اس کی زبان پر آیا، فریدی نے کرسی سے چھلانگ لگا دی اور حمید کے سنبھلنے سے پہلے وہ کمرے سے جا چکا تھا۔



فریدی نے ایک فائیل حید کے سامنے ڈال دیا جس میں دوسرے شہروں کے مفرور مجرموں کی تصاویر تھیں۔ حید سمجھ گیا کہ یہ کوئی گہری چال ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک فائیل کے صفحات التنازہ پر ایک چہرہ منتخب کر کے اسے فریدی کی طرف بڑھا دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس کے چہرے کی مرمت ہوتی رہی۔ پھر فریدی اسے گردن سے پکڑ کر کرسی سے اٹھاتا ہوا بولا۔

”تم جاوید پریمی ہو..... راگ رنگ کے دیوانے۔“

”مگر اس کا نام تو ستیش ہے۔“

”ہاں! مگر وہ ستیش کی حیثیت سے خود کو متعارف نہیں کرا سکتا۔ کیونکہ ایک مفرور مجرم ہے اور اسی لئے میں نے اس میک اپ میں ہلکی سی مونچھوں کا اضافہ کر دیا ہے اور میک اپ بھی اسی قسم کا ہے کہ بہت غور سے دیکھے جانے پر تم ستیش معلوم ہو گے۔“

”راگ محل میں کیا ہے۔“

”وہی سب کچھ جو میں تمہیں ابھی بتا چکا ہوں۔“

”یعنی آپ مجھے محض اس لئے وہاں بھیج رہے ہیں کہ وہ پرستان ہے۔“

”فی الحال تمہیں یہی سمجھنا چاہئے اور تم وہاں ان تقریبات کے علاوہ اس وقت تک اور کچھ نہیں کرو گے جب تک کہ تمہیں دوسری ہدایات نہ ملیں۔ خیر اب سنو کہ تم وہاں کس طرح پہنچو گے۔ ٹھیک دس بجے تمہیں فردوس منزل کے گیارہویں فلیٹ میں پہنچنا ہے۔ وہاں مسٹر پی سی راگی رہتے ہیں۔ وہ تمہیں راگ محل لے جائیں گے۔ راگ محل سے واپسی پر تم گھر نہیں آؤ گے بلکہ فردوس منزل کے سامنے والی عمارت کے آٹھویں فلیٹ میں فی الحال تمہارا مستقل قیام ہوگا۔ اس کی کتنی بھی تمہیں مل جائے گی جب تک کہ میں نہ کہوں تم گھر کا رخ بھی نہیں کرو گے..... کیا سمجھ!“

”سمجھ گیا..... اگر میں..... خیر جانے دیجئے۔“

”اچھی بات ہے جانے دو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”غیر ضروری باتوں سے جتنا بچتا

ہی اچھا ہے۔“

”سب کچھ تیار ہے۔ ممبری کے فارم پر تین پرانے ممبروں کے دستخط موجود ہیں اور ایک بہت ہی مقبول قسم کا ممبر تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جائے گا۔“

”میرا وہاں کیا کام ہوگا۔“

”کوئی آسان سا کام، جو بھی تمہیں پسند ہو۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”مثلاً وائیلن

سیکھنا..... حالانکہ تم بہت اچھا وائیلن بجاتے ہو مگر ذرا خود کو مبتدی ہی ظاہر کرنا۔ اس کے علاوہ جو تمہارا دل چاہے۔ اب اٹھو! میں بہت جلدی میں ہوں۔“

”کیا ابھی.....!“

”فی الحال تجربہ گاہ تک۔“

”میک اپ.....!“ حید نے برا سامنہ بنایا۔ ”نہیں..... میں بے تحاشہ تکلیف محسوس کرتا

ہوں۔ گرمیوں میں پلاسٹک کے ٹکڑے..... خدا کی پناہ۔“

”ڈرو نہیں..... کم سے کم پلاسٹک استعمال کروں گا۔“

”لیکن میں کوئی بدنما چہرہ نہیں برداشت کر سکوں گا۔“

”چلو! متعدد تصویریں تمہارے سامنے ہوں گی، جو پسند آجائے۔ اب اٹھو۔“

دور جدید کے سراغ رسانوں کے لئے میک اپ وغیرہ بڑی بھونڈی چیزیں ہیں۔ وہ اپنی تفتیش کی بنیاد منطق اور جرائم کی نفسیات پر رکھتے ہیں۔ مگر بہترے کیس ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں ہی چیزیں کارآمد نہیں ثابت ہوتیں۔ کیونکہ بعض مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے خلاف ثبوت بہم پہنچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی مجرموں کے لئے یہ طریقہ کسی حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ فریدی میک اپ کو کامیابی کا ذریعہ بنانے میں خوشی نہیں محسوس کرتا تھا مگر بعض اوقات مجبوراً اسے اس کا سہارا لینا ہی پڑتا تھا۔ ویسے اس نے میک اپ کی ان تمام خامیوں پر قابو پالیا تھا جن کی بناء پر میک اپ کرنے والوں کو دوسروں سے دور ہی دور رہنا پڑتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے میک اپ کئے ہوئے چہرے کو ایک فٹ کے فاصلے سے بھی نہیں پہچانا جاسکتا۔

اس وقت بھی اسے حید کے چہرے پر ایسا ہی میک اپ کرنا تھا۔ تجربہ گاہ میں پہنچ کر

نہیں۔ سارا ہال جمعہ نور بنا ہوا تھا۔ شاید اس وقت یہاں رقص کی مشق ہونے والی تھی کیونکہ زیادہ تر درجن لڑکیاں رقص کے لباس میں نظر آ رہی تھیں۔

ہال بہت بڑا تھا اور پر بھی چاروں طرف گیلریاں تھیں۔ حمید سر جھکائے راگی کے ساتھ ہنسا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ راگی بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ رقص لڑکیاں اتھاٹھا کر اسے سلام کر رہی تھیں۔

وہ حمید کو سیکرٹری کے کمرے میں لایا اور ممبر بننے کے سارے مراحل جلد ہی طے ہو گئے، بہت محسوس کر رہا تھا کہ سیکرٹری اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

یہ ادھیڑ عمر کا ایک صحت مند آدمی تھا لیکن اس کے لمبوترے چہرے پر چھوٹی سی فرنج کٹ ڈاڑھی کچھ اچھی نہیں لگتی تھی۔ ویسے بھی اس کی آنکھوں کی بناوٹ حلیم اور بردبار آدمیوں کی بناوٹ سے بہت مختلف تھی۔ حالانکہ وہ اپنے انداز گفتگو سے یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایک اچھے کردار کا با اصول آدمی ہے۔ وہ حمید سے رکی گفتگو کرنے کے بعد بولا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اس سے پہلے بھی آپ کو کہیں دیکھ چکا ہوں لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کہاں دیکھا تھا۔“

”ہو سکتا ہے..... میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔“ حمید نے اپنی آواز بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا..... ان معاملات میں وہ فریدی ہی کا شاگرد تھا۔

”تو آپ کا مستقل قیام یہاں نہیں رہتا۔“

”اب تو مستقل ہی ہے۔ میں دراصل.....!“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر ہنس کر بولا۔ ”کیا یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میرا پیشہ کیا ہے۔“

”نہیں..... قطعی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تین معزز ممبر اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ہی سفارش کر سکتے ہیں اور پھر راگی صاحب جیسے گریٹ آرٹسٹ کی ہر اسی نہیں مسٹر جاوید پریمی یہ کلامندر ہے۔ یہاں صرف روہیں دیکھی اور پرکھی جاتی ہیں۔ جسم اگر آلو چھو لے بھی بیچتا ہو تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگر آپ اپنے بیٹے کے متعلق مجھے نہیں بتانا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔“

حمید نے ٹھیک دس بجے فردوس منزل کے دروازے پر دستک دی۔ پی سی راگی کے متعلق وہ سوچتا آیا تھا کہ وہ کوئی دہلا پتلا خوبصورت سا بوڑھا ہوگا۔ فریدی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک بڑا فنکار ہے۔ اس کی ٹکر کا پیناسٹ کم از کم اس شہر میں تو ملنا مشکل ہی ہے، لہذا حمید کے ذہن میں اس کی تصویر فنکاروں ہی کی سی تھی۔

دستک دینے کے دو تین منٹ بعد دروازہ کھلا۔ دوسرے ہی لمحے میں حمید کے سامنے ایک لمبا ترنگا اور سیاہ فام آدمی کھڑا تھا۔ اس کے اگلے دو دانت نچلے ہونٹ پر رکھے ہوئے تھے۔

”مجھے راگی صاحب سے ملنا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”مل لیجئے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ اس کی مسکراہٹ بھی بڑی کریمہ تھی۔

”آپ ہی ہیں۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ وہ اسے فنکار کی بجائے کوئی جلا د معلوم ہو رہا تھا۔

”جی ہاں..... میں ہی ہوں..... فرمائیے۔“

حمید نے جیب سے وہی فارم نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا جس پر راگ محل کے تین ممبروں کے سفارشی نوٹ تھے۔

”اوہو..... اچھا..... اندر آ جائیے۔ میں آپ کا منتظر تھا۔ صرف دس منٹ بعد ہم روانہ ہو جائیں گے۔“ وہ پیچھے ہٹا ہوا بولا۔ حمید کمرے میں چلا گیا۔

راگی اسے وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حمید دیوار سے لگی ہوئی تصاویر دیکھنے لگا۔ اسے حیرت تھی کہ ایسا بد صورت اور بے ڈھنگا آدمی اتنا خوش مزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ سب اعلیٰ درجہ کی پینٹنگ تھیں۔

راگی حسب وعدہ دس منٹ بعد تیار ہو کر آ گیا۔ وہ دونوں باہر آئے۔ ایک ٹیکسی لی اور راگ محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

راگ محل ایک بہت بڑے ہال کا نام تھا۔ یہاں وہ سب کچھ تھا جو ایک بہترین قسم کی تفریح گاہ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ گیٹ پر پہنچے دو آدمیوں نے ان کا استقبال کیا اور پھر اصل عمارت کے دروازے پر قدم رکھتے ہی حمید کے کانوں سے موسیقی کی لہریں

”ہی.....!“ آواز کے انتہائی نقطہ عروج پر ساز خاموش ہو گئے اور صرف گھونگھروں کی ”چھنا چھنا“ باقی رہ گئی۔ پھر ”تو کون ہے..... تو کون ہے۔“ کا کورس شروع ہوتے ہی ساز پہلے ہی کی طرح گونجنے لگے۔

حمید کی روح اُن نعمات میں کھوئی جا رہی تھی مگر سیاہ فام اور بد صورت راگی کی آنکھیں اس کے ذہن کو جھوڑ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جن میں نفرت اس طرح کروٹیں بدل رہی تھی جیسے کسی ویرانے میں سانپ رینگ رہا ہو۔

”میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ سمجھے آپ۔“ وہ سیکریٹری کی میز پر ہاتھ مار کر بولا۔
 ”کیا بات ہے مسٹر راگی۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔“ سیکریٹری نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”آرٹسٹ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی رنگا ہو کر ناچنے لگے، انسانیت اور شرافت کا جنازہ نکال دے۔ آپ کے آرٹسٹ بدتمیز اور غیر مہذب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”میں پھر نہیں سمجھا مسٹر راگی۔“

”میں راگی کی بدتمیزی کے متعلق کہہ رہا ہوں۔“

”بدتمیزی؟“ سیکریٹری نے حیرت سے کہا۔ ”نہیں تو مسٹر راگی۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!“
 ”کیا نئے آدمیوں سے گفتگو کرنے کا یہی طریقہ ہے۔“

”اوہو..... مسٹر راگی۔“ سیکریٹری نے ایک طویل قہقہہ لگایا جو سو فیصدی تصنعاً میز تھا پھر بولا ”عجب ہے آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ ایک شوخ اور مست الست قسم کی لڑکی ہے۔“

”ہاں! راگی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”اور بعض اوقات وہ اس سرمستی کے عالم میں فاحش عورتوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ سیکریٹری صاحب! سچا آرٹسٹ کبھی خود کو پوز نہیں کرتا۔ اُس کی روح ہر وقت ناچتی رہتی ہے لیکن اوپر سے وہ کسی حسیل کی طرح پرسکون نظر آتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی کے بجائے ایک پروقار قسم کا ٹھہراؤ ہوتا ہے۔“
 ”اس کے لئے بڑے ظرف کی ضرورت ہے مسٹر راگی۔“ سیکریٹری نے کہا۔ ”آپ بہت بڑے آرٹسٹوں کی باتیں کر رہے ہیں۔“

حمید جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا..... ایک لڑکی چھن چھن کرتی ہوئی کمرے میں کمر آئی۔ اس کے پیروں میں گھونگھرو بندھے ہوئے تھے اور وہ رقص کے لباس میں تھی۔

”یہ کون ہیں؟“ اس نے حمید کی طرف اشارہ کر کے سیکریٹری سے پوچھا۔ انداز میں بڑھوٹا پن تھا لیکن لہجے کی ذرا سی لغزش اُسے بھونڈے پن میں بھی تبدیل کر سکتی تھی۔ ہر اداکاری کے اس حسن کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

لڑکی بڑی دلکش تھی۔ آنکھیں کنول تھیں اور ہونٹ گلاب کی پتھڑیاں۔ حمید جلدی میں صرف یہی دو تشبیہیں سوچ سکا کیونکہ اُس کے جسم کی ہر جنبش پر کسی نہ کسی عضو کا حسن ایک نئے انداز میں ظاہر ہو رہا تھا اور حمید کا ذہن تشبیہات کے التزام میں اتنی تیز رفتاری کا ثبوت دینے سے قاصر تھا۔

”یہ ہمارے نئے ساتھی مسٹر پری ہیں۔“

”ہااا!“ وہ ایک سریلی سی چیخ کیساتھ حمید کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوئی بولی۔ ”میں راگی ہوں۔“

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“ حمید نے گرم جوش سے مصافحہ کیا۔

”کیوں راگی صاحب۔“ وہ حمید کو کچھ اور کہنے کا موقع دیئے بغیر راگی سے بولی۔ ”اس وقت اجنبی والا رقص کیا رہے گا۔“

”ہوں..... میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ راگی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ حمید سمجھ گیا کہ اُسے راگی کی بے تکلفی گراں گذری ہے۔ راگی چھن چھن کرتی دوڑتی چلی گئی اور پھر فوراً ہی ایک باریک سی آواز ساز کے پردوں پر لہرائی چلی گئی۔

”اے..... اجنبی!“

شاید یہ راگی کی آواز تھی۔ ”اجنبی“ کو اتنا کھینچا گیا کہ آواز بتدریج باریک ہوتے ہوئے سناٹے میں گم ہو گئی اور پھر مختلف قسم کے سازوں کی موسیقی کا طوفان سامنے پڑا۔ ساتھ ہی بہت سی سریلی آوازوں کا کورس بھی گونجا۔

”تو کون ہے..... تو کون ہے۔“

تھمتے ہوئے سازوں کے درمیان سے وہی باریک سی آواز پھر بتدریج بلند ہو رہی تھی۔

”میں اس کلامندر کے ہر آرٹسٹ کو بڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ہر آرٹسٹ بڑا نہیں ہو سکتا۔“

”اگر نہیں ہو سکتا تو راگی کو یہاں سے ہمیشہ کے لئے جانا پڑے گا۔“

”اررر..... نہیں..... مسٹر راگی!“ سیکریٹری بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”آپ کے

بغیر راگ محل فن کا مقبرہ بن جائے گا۔ نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میں کب چاہتا ہوں کہ ایسا کروں..... مگر..... آپ حالات کو دیکھ ہی رہے ہیں۔“

”اچھا دیکھئے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ مگر آپ ہمیں نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ

راگ محل کی زندگی ہیں۔“

یہ گفتگو راگی کی خاموشی پر ختم ہو گئی۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ حمید اس دوران میں برابر راگ محل جاتا رہا تھا لیکن اب

اس چیز کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ ہمیشہ راگی کے ساتھ ہی وہاں جاتا۔ کئی لڑکیاں اُس

سے کافی محل مل گئی تھیں لیکن سرلا اُسے ایک دن بھی نظر نہ آئی۔ اُس نے اس کے متعلق بہت

غور کیا لیکن کچھ بھی سمجھ نہ آیا۔ وہ اپنے محلے کے سادہ لباس والوں کو راگ محل کے گرد منڈلاتے

دیکھتا اور سوچتا شاید یہ سب کچھ سرلا ہی کے لئے ہو رہا ہے مگر سرلا تھی کہاں؟ راگ محل کا چپہ چپہ

حمید نے دیکھ ڈالا تھا اور یہ چیز اُس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ وہاں کوئی چھپنے کی جگہ

بھی ہوگی۔ وہ سوچتا شاید فریدی سرلا کے معاملے میں اپنی ہی کسی غلطی کا شکار ہو گیا ہے۔ سرلا

اُسے دھوکا دے کر یہاں سے نکل گئی اور وہ شاید یہی سوچتا رہ گیا کہ وہ وہیں چھپی ہوگی۔ اس

کے علاوہ حمید اور کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ ویسے کسی دوسرے پہلو سے راگ محل کے متعلق کچھ

سوچنا فضول ہی تھا۔ فریدی اُسے وہاں اس لئے نہیں بھیج سکتا تھا کہ خود راگ محل ہی کسی قسم کے

جرائم کا مرکز ہے۔ وہاں تو صحیح معنوں میں مختلف قسم کے فنون کی خدمت ہو رہی تھی اور وہاں

صرف چیدہ چیدہ ہستیوں کا گذر ہو سکتا تھا۔ اسی بناء پر اکثر راگ محل کے خلاف طوفان بھی اٹھا

کرتے تھے لیکن انہیں بڑی سختی سے دبا دیا جاتا تھا کیونکہ شہر کے بہترے سربراہ اور وہ لوگ اس

کے سرپرست تھے۔

لیکن وہ شام حمید کے لئے بڑی سنسنی خیز تھی جب اُسے راگ محل میں ایک نیا تجربہ ہوا۔

ایک رقص کرنے والی لڑکی کے لئے وائیلن بجا رہا تھا کہ ایک ملازم نے اُسے سیکریٹری کا

پیام دیا۔ وہ اس سے اپنے آفس میں ملنا چاہتا تھا حمید اپنا شغل ترک کر کے اُس کے کمرے

میں داخل ہوا۔

”اوہ آئیے مسٹر تیش.....!“ سیکریٹری نے مسکرا کر کہا اور حمید بیساختہ چونک پڑا۔ وہ

یہاں کی رنگ رلیوں میں پڑ کر یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ ایک مفروضہ مجرم کے میک اپ میں

ہے ورنہ شاید اُس کے چونکنے کے انداز میں اتنی بیساختگی نہ پیدا ہو سکتی۔ بہر حال وہ دوسرے ہی

لحظے میں مسکرا کر بولا۔

”مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ مجھے غلط نام سے مخاطب کر رہے ہیں۔ میرا نام

جاوید پریمی ہے۔“

”آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ مگر میرا خیال ہے کہ پولیس سے بچنے کے لئے صرف یہ

موجنیں ہی کافی نہ ہوں گی۔“

”کیا آپ نشے میں ہیں مسٹر سیکریٹری۔“ حمید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”نہیں مائی ڈیئر مسٹر تیش.....!“

اب حمید کو محسوس ہوا کہ فریدی نے اُسے اس میک اپ میں وہاں کیوں بھیجا تھا کیونکہ وہ

سیکریٹری کے ہاتھ میں ایک ریوالور دیکھ رہا تھا۔ بھلا راگ محل میں ریوالور کا کیا کام؟ سیکریٹری

نے ریوالور کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”راگ محل یا جیل..... ان میں سے آپ کے ترجیح دیں گے۔“

”کیا یہ کسی ڈرامے کا ریہرسل ہے مسٹر سیکریٹری۔“ حمید نے لا پرواہی سے مظاہرہ کیا۔

”آپ جانتے ہیں مسٹر تیش کہ راگ محل میں آج تک کوئی ڈرامہ نہیں ہوا۔ یہاں کے

حقائق ہی اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ تفریح کے لئے قصے کہانیوں کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ اب یہی

دیکھ لیجئے کہ جنوبی صوبے کا ایک قاتل راگ محل میں آرٹ کی خدمت کر رہا ہے۔ اگر میں یہاں

کے سارے فنکاروں کو اکٹھا کر کے اُسے بے نقاب کر دوں تو کیسی رہے۔“

آہستہ آہستہ حمید کو عقل آر رہی تھی۔ اچانک اُس نے سرد اور سفاک قسم کے لہجے میں کہا۔
 ”اُس سے پہلے یا تو تم مر جاؤ گے یا تیش ہی مر جائے گا۔“
 ”میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔“ سیکریٹری نے مسکرا کر کہا۔

”تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ جسے میں نے قتل کیا تھا اس کے ساتھ چھ آدمی تھے۔ اگر میں اُن میں سے ایک کو قتل نہ کر دیتا تو میرا قتل ہو جانا لازمی تھا۔“

”تب تو تم نے اُسے حفاظت خود اختیاری کے تحت قتل کیا تھا۔“ سیکریٹری نے حمید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایسی صورت میں تمہیں فرار نہ ہونا چاہیے تھا۔“
 ”مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ میں دوسری بار بھی اپنی حفاظت کر سکتا۔“

”تم تنہا تھے۔“ سیکریٹری نے پوچھا اور اثبات میں جواب پا کر دوبارہ سوال کیا۔ ”کیا اب بھی تنہا ہو۔“

”ہاں میں اب بھی تنہا ہوں لیکن تم نے مجھے اس طرح پہچانا ہے جیسے میری تلاش میں رہے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اس ریوالور کا لائسنس ہے۔“

”ریوالور..... ریوالور کی بات جانے دو۔ میں تم سے فی الحال ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک یہ سودا ہے لیکن انکار کی صورت میں حکم بن جائے گا اور اس کے بعد تمہارے مقدر میں یا تو جھکڑیاں ہوں گی یا کسی ریوالور کی گولی تمہارے خطہ تقدیر میں سرخ تحریر کا اضافہ کر دیگی۔“
 ”یار سیکریٹری صاحب۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”تم تو شیکسپیر کے کسی ویلن کی طرح بول رہے ہو۔ میں اسے دھمکی سمجھوں یا لڑچکر میں ایک حسین اضافہ۔“

”مجھے اور زیادہ خوشی ہوئی۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔“ سیکریٹری نے خشک لہجے میں کہا۔
 ”دلیر بھی ہو تنہا بھی ہو تمہیں ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ تم جانتے ہو کہ راگ محل کی دیواریں کتنی مستحکم ہیں۔ کیا یہاں کے کسی فرد پر کسی قسم کی آج بھی آسکتی ہے۔“
 ”نہیں..... قطعی نہیں..... پھر.....!“

”پھر تمہیں فی الحال ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔ خوشی سے نہ کرو گے تو زبردستی۔ لیکن تم

پاں نہیں سکتے۔ جب بھی ارادہ کیا جہاں کہیں بھی ہو گے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔ ہمارے آدمی ہر وقت تمہاری نگرانی کریں گے۔“

حمید تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ”کام کی نوعیت معلوم کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن دھوکہ نہ ہو، ورنہ میں بخشتا تو جانتا ہی نہیں۔“

”تمہیں ریگل لاج میں ایک چھوٹا سا پیکٹ پہنچانا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں تمہیں خطرات سے بھی آگاہ کر دوں تاکہ دھوکے کا احتمال نہ رہے۔ میرے ساتھ آؤ۔“ وہ اُسے وہاں سے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

راگ اور خون

تقریباً دو گھنٹے بعد حمید راگ محل کے باہر آیا۔ اس کے ساتھ میں ایک خوبصورت سا پیکٹ تھا۔ لٹی بکٹ کا پیکٹ۔ وہ اُسے یونہی کھلے عام ہاتھ میں دبائے ہوئے چل رہا تھا۔ اس پیکٹ کے لئے اتنی راز داری! حمید سے کہا گیا تھا کہ وہ اُسے آٹھ دس آدمیوں کی نگرانی میں ریگل لاج تک لے جائے گا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہے ہوں گے لیکن وہ اُن کی شخصیتوں سے ناواقف تھا۔ ویسے اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ سچ سڑک پر بھی قتل کیا جاسکتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس پیکٹ میں ہے کیا؟ وہ اسے اجنبی ہاتھوں میں دینے جا رہا تھا اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہوگا کون۔ اس سے تو یہ کہا گیا تھا کہ جس کے لئے یہ پیکٹ بھیجا جا رہا ہے وہ خود ہی اُسے پہچان کر اس سے لے لے گا۔ اس اتنے سے کام کی اجرت پانچ بڑے نوٹوں کی شکل میں دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ وہ پیکٹ علانیہ طور پر لے جایا جا رہا تھا اور آٹھ دس آدمی چھپ کر اس کی حفاظت کر رہے تھے اور پھر اسے پیدل ہی ریگل راج تک پہنچانا تھا۔ جس کا فاصلہ راگ محل سے ڈھائی میل ضرور رہا ہوگا۔ حمید چلتا رہا۔ وہ اب تک ایک میل تک پیدل چل چکا تھا۔

اس وقت شہر کے ایک بھرے پڑے حصے سے گزرتے وقت بھی موت اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اچانک ایک گلی سے ایک چھوٹا سا جلوس نکلا۔ حمید پہلے ہی سے اس

کے نعرے سنتا رہا تھا۔ غالباً یہ جلوس کارپوریشن کے ایکشن سے تعلق رکھتا تھا۔

”اپنا ووٹ کس کو دو گے؟“ ایک آدمی چیخا۔

”بندے علی کو۔“ درجنوں آوازیں ہم آہنگ ہو جاتیں۔

وہ جلوس کچھ اس طوفان بدتمیزی کی طرح گلی سے نکلا کہ حمید کے پاؤں اکھڑ گئے۔ کئی آدمی بیک وقت اُس سے آنکرائے تھے اور پھر..... لٹی بسکٹ کا پیکٹ بھی اُس کی گرفت سے نکل گیا۔ بس پھر کیا تھا..... کھوپڑی ہوا ہو گئی۔ بوکھلاہٹ میں اُس کا ہاتھ ایک ایک کے گریبان پر پڑنے لگا۔ جلوس تتر بتر ہو گیا۔

”کیا ہے! کیا ہے۔“ کسی نے چیخ کر پوچھا۔

”مخالف پارٹی کا آدمی..... شیخ چھتانی کا آدمی۔“

”مارو سالے کو.....!“

سالے کے حواس غائب ہو گئے اور وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ جلوس چیخا چنگھاڑتا ہوا اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور سڑکیں جگمگا رہی تھیں۔ لیکن یہاں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قیامت آگئی۔ بعض راگبیروں نے بھی دوڑنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ خوف کی وجہ سے بھاگ رہے تھے۔ دوسروں کو بھاگتے دیکھا، خود بھی بھاگ لئے۔ دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں تھیں۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اب اگر ایسے موقع پر کسی کے ہاتھ آ گیا تو کچھ مر نکل جائے گا۔ اچانک وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ لیکن اس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ یہ فعل قطعی غیر ارادی طور پر سرزد ہوا تھا۔ بہر حال اس کے ستارے اچھے ہی تھے کہ آگے چل کر گلی تاریک ہو گئی تھی۔ وہ بے تحاشہ دوڑتا ہی رہا۔ اس کے پیروں میں کریپ سول جوتے تھے اور وہ بیچوں کے بل دوڑ رہا تھا۔ اس لئے آواز بھی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک تاریک گلیوں میں چکراتا رہا۔ پھر اُس نے سوچا کہ اب اسے سڑک پر نکل جانا چاہئے۔ تعاقب کرنے والوں کی آوازیں بھی اب نہیں سنائی دیتی تھیں۔

اُسے اچھی طرح یاد نہیں کہ وہ کس طرح اپنی قیام گاہ تک پہنچا۔ یہ اُسی عمارت کا ایک فلیٹ تھا جہاں فریدی نے اُسے ٹھہرنے کو کہا تھا۔

وہ پلنگ پر گر کر ہانپنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے بہت ہی تیز قسم کا بخار ہو گیا ہو۔ کیونکہ اس وقت اس کے خیالات بڑے ”ہندیانی“ قسم کے ہو رہے تھے۔ بے سرو پا اور وہ ہانپ رہا تھا اور غصے کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ گالیاں بھی بے تنگی اور مہمل ہی تھیں، جو دل ہی دل میں سراغ رسانی اور سراغ رسانوں کو دے رہا تھا۔

وہ آدھ گھنٹے تک بے سدھ پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر دو تین گلاس پانی چڑھا گیا۔ لٹی بسکٹ کا پیکٹ اُس کے ذہن میں تھا۔ اس وقت اس کے اعصاب پر فریدی سوار تھا، جو کچھ سوچے سمجھے بغیر اُسے جہاں چاہتا تھا جھونک دیتا تھا۔ بہت دیر بعد اُسے وہ پیکٹ یاد آیا لیکن وہ گالیاں کھائے بغیر نہ رہ سکا۔

ویسے اُس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اس کی دانست میں وہ اُسی آدمی کے ہاتھ لگا ہو گا جس کے لئے بھیجا گیا تھا۔

اُس کا جواز جواز دکھنے لگا تھا اور تھکن بھی شباب پر تھی۔ وہ ملبوسات کی الماری کی طرف بڑھا کہ اب لباس تبدیل کر کے سو جائے۔ اتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”ارے..... کیا مصیبت آگئی ہے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور چنچنی گرا دی۔ دروازہ کھلا اور سامنے راگ محل کے دو ایسے آرٹسٹ کھڑے نظر آئے جن سے حمید کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

”تمہیں راگ محل تک چلنا ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔

اس کا لہجہ اتنا خراب تھا کہ حمید کو غصہ آ گیا۔ اُس نے بگڑ کر کہا۔ ”ضروری نہیں ہے۔ اب میں سونا چاہتا ہوں۔“

لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس نے دیکھا کہ اُن کے کوٹوں کی جیبوں سے ریو الوور کی نائلیں جھانک رہی ہیں اور آنکھوں میں سفاکی اور درندگی تو پہلے ہی سے نظر آ رہی تھی۔

حمید نے چپ چاپ مڑ کر اپنی فلیٹ ہیٹ اٹھائی۔ باہر نکل کر دروازے کو مقفل کیا اور اُن کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ ان دونوں کے بیچ میں تھا اور وہ اس سے لگے ہوئے چل رہے تھے۔ باہر سڑک پر ایک کار موجود تھی ایک نے حمید کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسرا اسٹیرنگ کے

سامنے جا بیٹھا۔ کار چل پڑی۔

حمید اپنی بائیں پٹلی میں ریوا اور کی نال کی چھن محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے سٹکیوں سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے آرٹسٹ کو دیکھا پھر اس طرح نشست کی پشت گاہ سے نک گیا جیسے وہ سب کچھ مذاق ہی ہو۔ حمید انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ذرہ برابر بھی خائف نہیں ہے۔ راگ محل میں اس وقت صرف تین لڑکیاں بیٹھیں اور طلبے پر رقص کی مشق کر رہی تھیں۔ حمید کچھ اس درجہ بوکھلایا ہوا تھا کہ نہ تو اسے پیانو کی آواز سنائی دی اور نہ وہ رقص کرتی ہوئی لڑکیاں ہی دکھائی دیں۔

حمید کو سیکریٹری کے آفس میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا لیکن یہاں بیٹھی ہوئی عورت پر اس کی نظر فوراً پڑ گئی۔ یہ سرلا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سیکریٹری کے علاوہ ایک آدی اور بھی تھا جس کے چہرے پر سرخ رنگ کی داڑھی تھی اور آنکھوں پر تاریک شیشوں والی عینک۔ حمید نے اس پہلے پہل دیکھا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ سیکریٹری نے حکمانہ لہجے میں کہا۔

حمید نہ جانے کیوں یہاں پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اُس نے چاروں طرف اچھتی ہوئی سی نظر ڈالی اور پھر جواب طلب نظروں سے سیکریٹری کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ پیکٹ کہاں ہے؟“ سیکریٹری نے گرج کر پوچھا۔

”یہ کہو کہ اب تمہاری نیت میں فتور آ گیا ہے۔“ حمید نے بھی بالکل اُسی کے سے انداز

میں جواب دیا۔

”کیا مطلب.....؟“

”یہی کہ تم وعدہ کے مطابق مجھے پانچ سو روپے نہیں دینا چاہتے۔“

”کیا تم نے اُسے ریگل لاج تک پہنچا دیا تھا۔“

”نہیں وہ راستے ہی سے خود بخود ریگل لاج تک جا پہنچا۔“

سیکریٹری اُسے چند لمحے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”سنیدگی سے گفتگو کرو، ورنہ ہو سکتا ہے کہ

یہیں تمہاری لاش پھرنے لگے۔“

”مجھے لاشوں سے خوف نہیں معلوم ہوتا اور میں بالکل سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں۔“

”جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کیجئے۔“ سرلا نے نیجر سے کہا۔

”یہ مجھ سے عشق نہیں کریں گے محترمہ۔“ حمید اُسے آنکھ مار کر بولا اور سرلا بوکھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”تم زیادہ بکواس نہ کرو۔ پیکٹ واپس کر دو۔“

”اگر وہ میرے پاس ہو تو ضرور واپس لے لو۔“

”کس کے پاس ہے۔“

”اوہ مسٹر سیکریٹری۔“ حمید کا لہجہ دفعتاً نرم ہو گیا۔ ”کیا ممکن نہیں ہے کہ اُس آدمی نے

راستے ہی میں مجھ سے وہ پیکٹ لے لیا ہو۔“

”میں احمق نہیں ہوں۔“ نیجر غرایا۔

”اگر میں تمہیں احمق سمجھتا ہوں تو مجھے یقیناً گولی مار دو.....!“

”تم نہیں بتاؤ گے۔“

”کیا تمہارے آدمی اندھے تھے جن کی نگرانی میں مجھے ریگل لاج بھیجا گیا تھا۔ کیا انہوں

نے نہیں دیکھا تھا۔ کیا انہوں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے کس طرح اُس غول بیابانی سے

اپنی جان بچائی تھی۔ آخر کوئی دوسرا وہ پیکٹ چھیننے ہی کیوں لگا۔ بظاہر وہ بسکٹوں کا پیکٹ تھا۔“

”لیکن حقیقتاً کیا تھا۔“ نیجر نے سوال کیا۔

”میں کیا جانوں..... میں نے اُسے کھول کر دیکھا نہیں تھا۔ کیا نگرانی کرنے والوں نے

یہ بھی نہیں بتایا۔“

”اچھا دوست تم بھی کیا یاد کرو گے۔“ سیکریٹری نے بڑبڑا کر سرخ داڑھی والے کی طرف

دیکھا اور سرخ داڑھی والے نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”سرلا.....!“ سیکریٹری نے سرلا سے کہا۔ ”تم باہر جاؤ..... تم نے آج تک کسی کو قتل

نہ کیے دیکھا ہوگا۔“

”پہلے پیکٹ کا سراغ ملنا چاہئے۔“ سرلا بولی۔ ”قتل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ اگر وہ غلط

ہاتھوں میں پہنچ گیا تو۔“

”تم جاؤ تو۔۔۔۔۔!“

حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا لیکن اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیکریٹری نے شام ہی کو میز کی دروازے سے ایک ریوالور نکالا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی وہیں موجود ہو۔ دفعتاً کسی نے دروازے کو دھکا دیا۔

”کون ہے؟“ سیکریٹری نے غصیلی آواز میں کہا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں دروازہ کھل گیا۔ سامنے راگی کھڑا تھا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ ”مسٹر راگی۔“ سیکریٹری نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے افسوس ہے اس وقت ہم ایک پرائیویٹ موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں۔“

”اوہ اچھا! میں جا رہا ہوں۔“ راگی دروازے کی طرف مڑا۔

”ٹھہریے مسٹر راگی۔“ حمید نے بلند آواز میں کہا۔ ”بھلا مجھے ان کے پرائیویٹ موضوعات سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”تو پھر چلے۔“ راگی نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

”نہیں مسٹر راگی آپ جاییے۔“ سیکریٹری جھنجھلا کر بولا۔ ”میں ان حضرات کی اصلیت سے واقف ہو گیا ہوں۔“

”اوہو! تو آپ بھی واقف ہو گئے ہیں۔“ راگی نے حیرت سے کہا۔

”ارے مسٹر راگی تو کیا آپ جان بوجھ کر ایک مفرور قاتل کو آرٹسٹ بنالائے تھے۔“ سیکریٹری شکایت آمیز لہجے میں بولا۔

”مفرور قاتل۔۔۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ راگی نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ ”ارے یہ تو شہر کا سب سے بڑا عورت خور کیپٹن حمید ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ سیکریٹری اچھل پڑا۔ سرخ داڑھی والا بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ سرلا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں حمید نے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی لیکن راگی نے اسے اس طرح اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا جیسے کبھی شریر بچے کو دوڑتے میں پکڑ لے۔

”آپ کہاں چلے حمید صاحب۔“ اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ یہاں بھیس بدل رہا بیٹا کرنے آئے تھے لیکن یہ کلامندر ہے۔ آوارہ پریوں کا اکھاڑہ نہیں۔ آپ کی شامت نہ آپ کو یہاں لے آئی تھی۔“

دفعتاً سرخ داڑھی والا خنجر کھینچ کر اُس کی طرف جھپٹا۔ لیکن قریب پہنچنے سے پہلے ہی راگی نے اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ خنجر پھینک کر دوہرا ہو گیا۔

سیکریٹری میز کی دروازے سے ریوالور نکال چکا تھا۔ وہ اُس کا رخ اُن دونوں کی طرف کرتا ہوا بولا۔ ”تو مسٹر راگی تم لازمی طور پر کرنل فریدی ہو۔“

”اب آپ کو شاید خواب آرہے ہیں۔“ راگی مسکرا کر بولا۔ ”میں تو اس عورت خور کو اچھا بن دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے اب تک خاموش اور موقع کا منتظر تھا لیکن اگر آپ مجھے فریدی سمجھتے ہیں تو چلے یہی سہی۔ میں چھ ماہ سے آپ کے کلامندر کی سیوا کر رہا ہوں۔“

سیکریٹری بے درپے ریوالور کا ٹریگر دباتا ہی چلا گیا۔ کھٹ کھٹ کی آواز کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ریوالور خالی تھا۔

راگی یا فریدی نے پرزور تہقیر لگایا۔ اب اُس نے حمید کو چھوڑ دیا تھا۔

”جہاں فریدی ہو، وہاں بغیر لائسنس کے ریوالوروں کا دم نکل جاتا ہے۔ مسٹر سیکریٹری۔“

حمید کے جانے کے بعد سرشام ہی خالی کر دیا گیا تھا۔

سرخ داڑھی والا جو اب بھی پیٹ پکڑے زمین پر بیٹھا ہوا تھا اپنی دانست میں ان دونوں سے نظر بچا کر خنجر کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔ ادھر اُس کا ہاتھ خنجر کے دتے پر پڑا اور ادھر فریدی کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پہنچ گیا۔ سرخ داڑھی والا ایک بار پھر درد کی شدت سے چیخا لیکن اگر اس ”ران“ میں فریدی بڑی پھرتی سے جھک نہ گیا ہوتا تو سیکریٹری کے پھینکے ہوئے ریوالور کا اس کے سر پر جا پڑنا لازمی تھا۔ سرلا ایک کنارے کھڑی بڑی طرح کانپ رہی تھی۔

”حمید تم دروازے پر ٹھہرو۔“ فریدی نے کہا۔ ”سنا ہے سیکریٹری صاحب کو اپنی طاقت پر بہت ناز ہے۔ مجھے ہے کہ یہ پی سنگ کی ہڈیاں کتنی دیر میں توڑ سکتے ہیں۔“

”پی سنگ۔۔۔۔۔ کہاں ہے۔“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”اس کی عینک اتار دو اور داڑھی نوچ ڈالو۔ پی سنگ کا دیدار نصیب ہو جائے گا۔“
سکریٹری گھونسا تان کر فریدی کی طرف جھپٹا لیکن فریدی جب سے ریوالور نکالتا ہوا ہوا
”جہاں ہو وہیں غمرو! میں آج لڑنے بھڑنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

پھر حمید سے کہا۔ ”دروازہ بند کر دو۔ یہ تو میرے اصول کے خلاف ہے کہ کوئی مجرم ٹوٹ
بھوٹے بغیر شریف آدمیوں کی طرح حوالات میں چلا جائے۔“

حمید نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ پھر تیز نظر آنے لگا تھا۔
”ہاں تو سکریٹری صاحب آپ بہت طاقتور ہیں..... اوہو! آپ مطمئن رہئے۔ اس
وقت راگ محل میں ہم چاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کے آدمیوں کو پہلے ہی
یہاں سے باہر ہانک چکا ہوں۔ وہ کسی سڑے سے بار میں اس وقت شراب پی رہے ہوں
گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا سکریٹری صاحب کہ آپ بہت طاقتور ہیں لہذا سڑا کے بال پکڑ کر
اُسے زمین سے اٹھا لیجئے۔“

سکریٹری بدستور اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

”چلئے! چلئے! ورنہ میرے ریوالور کی گولی کم از کم آپ کی ران کی ہڈی ضرور توڑ دے گی
اور ابھی آپ کو پی سنگ پر بھی قوت آزمائی کرنی پڑے گی۔ گو کہ آپ اُس کے ایک ادنیٰ غلام
ہیں۔ سرالہی وہ مجرم ہے جس کی وجہ سے لڑکیوں میں پاگل پن کی وباء پھیلی ہے۔“
”نہیں..... نہیں۔“ سرالہی خوفزدہ آواز میں چیختی۔

”اوہو..... کیا تم نے ڈاکٹر زیدی کے اُس عرق کا فارمولا نہیں چرایا تھا جو وہ قوت حافظ
کے لئے تیار کر رہے تھے۔“

سرالہی کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ کھڑی کا پتی رہی۔ فریدی نے سکریٹری سے کہا ”کہاں
ہے وہ عرق اسے نکالو۔ تم بھی پیو اور پی سنگ کو بھی پلاؤ۔ ظاہر ہے تم دونوں کو بھی مجھ پر غصہ
آ ہی رہا ہوگا۔ اُسے پی کر تم یہ بھی بھول جاؤ گے کہ میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ پھر اپنا کام
نہایت آسانی سے انجام دے سکو گے۔“

”یہ سب بکواس ہے۔“ پی سنگ نے چیخ کر کہا ”تم خولہ خواہ میں چھاننے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”بیٹے پی سنگ..... میں ایک سال سے تمہارے چکر میں ہوں۔ اگر اس میں نہیں تو کسی
بے معاملے میں پھنس جاؤ گے۔ تم نے قتل کرائے ہیں اور اب اس عرق کے ذریعہ شہر کو جہنم
ہے ہو۔ لڑکیوں کو اس کی لت پڑ گئی ہے۔ وہ اپنے گھروں سے بڑی بڑی رقیں غائب
کے اسے خریدتی ہیں، اسی لئے یہ وباء غریب گھرانوں کی لڑکیوں میں نہیں پھیل سکی۔“

”سب جھوٹ ہے! بکواس ہے۔ یہ نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ تم میرے پرانے دشمنوں میں سے ہو۔“
”میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اُسے عدالت میں ثابت کرنے کے لئے میرے پاس بے
شبوت ہیں۔ ڈاکٹر زیدی نے حقیقتاً یہ عرق طالب علموں ہی کے لئے بنانے کی کوشش کی تھی۔
اے پی کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ذہن پر جلا ہو گئی اور پھر یادداشت حیرت انگیز طور پر ذہن
تاریک گوشوں کو کریدنے لگتی ہے۔ مگر اس میں دو خامیاں رہ گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ شراب
زیادہ نشہ آور ہو گیا تھا اور دوسری یہ کہ اگر اس کے نشے کی حالت میں آدمی کو غصہ
پائے تو وہ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے، ڈاکٹر زیدی کو دوسری خامی کا علم نہیں تھا۔ یہ سو

بندی میری دریافت ہے۔ تم یوں بھی غیر قانونی طور پر شراب کشید کرتے رہے ہو۔ سرالہی سے
نی اور نئے بیوپار کے متعلق مشورہ لیا۔ تم اس پر روپیہ لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ سرالہی تمہارے
نئے عرق کشید کرتی رہی اور تم اسے اپنے چند خوبصورت ایجنٹوں کے ذریعہ مالدار گھرانوں کی
لڑکیوں میں کھپاتے رہے۔ وہ شروع میں اپنی قوت حافظہ بڑھانے کے لئے اُسے استعمال کرتی
ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس بُری طرح اس کی عادی ہو گئیں کہ انہیں ہر وقت نشے کی ضرورت
محسوس ہونے لگی اور اب تم دونوں ہاتھوں سے روپیہ بنو رہے ہو۔ تمہارے ایجنٹ ان لڑکیوں کو
جنگلی دیتے ہیں کہ وہ عرق کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتائیں ورنہ پھر انہیں اس کی ایک بوند بھی نمل
لے گی۔ لہذا وہ اصلاح خانوں کی قید برداشت کر لیتی ہیں مگر اس عرق کی ہوا تک نہیں لگنے
دیتیں، چونکہ وہ ہر وقت اس کے نشے میں رہنا چاہتی ہیں لہذا جب کبھی بھی نشے کی حالت میں
نہیں غصہ آ جاتا ہے تو وہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہیں۔ سرالہی خود بھی اس نشے کی عادی ہے
اور اس کے نشے اور غصے نے ہماری توجہ راگ محل کی طرف مبذول کرائی تھی۔ ورنہ ویسے بھی
ہاں میں چھ ماہ سے راگی آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں لیکن وہ دوسرا چکر تھا۔ میں

دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں پی سنگ کی سرپرستی میں کیا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب میں اپنی اس حرکت کو ”پیش بینی“ کا نام دے دوں..... خیر ختم کرو۔ مگر نہیں آج کا لطیفہ بھی سنتے چلو۔ حمید یہاں اس شکل میں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم اس سے کسی قسم کا کام لو۔ تم لوگوں کی اس حرکت سے میں پہلے واقف تھا کہ تم قانون سے بھاگے ہوئے مجرموں کو سہارا دے کر ان سے مختلف قسم کے کام لیتے ہو۔ ادھر چونکہ تمہارے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ میں تمہارے سارے آدمیوں سے واقف ہوں اس لئے تم نے اس تقسیم کاری کے لئے راگ محل کو منتخب کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تقسیم کرنے والے ایسے آدمیوں کی ضرورت بھی درپیش ہو سکتی ہے جو بالکل نئے ہوں اور جن پر میری نظر بھی نہ ہو۔ تم نے اپنے پرانے دستور کے مطابق حمید کوئی مفرد مجرم سمجھ کر پھانسنے کی کوشش کی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ نہیں پی سنگ تم چپ چاپ کھڑے رہو گے۔ ہاں اور وہ جلوس جس کے زرعے میں آ کر حمید نے پکٹ کھویا تھا میرا ہی ترتیب دیا ہوا تھا۔ مگر حمید کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی ورنہ اتنی شاندار ایکٹنگ نہ کر سکتا۔

”کیا.....!“ حمید حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”حمید کا شاندار جنازہ کیسا رہے گا۔“

”جلوس ہی کی وجہ سے تم بچ گئے بیٹے..... ورنہ بیک وقت آٹھ گولیاں تمہارے جسم کو چھلنی کر دیتیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا اور پھر اُس نے سیکرٹری سے کہا۔ ”میرے پاس وقت کم ہے۔ سرلا کو بال پکڑ کر زمین سے اٹھاؤ..... چلو.....!“ ساتھ ہی اُس نے فائر بھی کر دیا۔ گولی اس کی بائیں ران کو چھوتی ہوئی گذر گئی۔ سیکرٹری اچھل کر ایک طرف ہٹا اور کرسی سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنی ران ٹول رہا تھا۔ پھر وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور بے تحاشہ سرلا کی طرف جھپٹا۔ دوسرے ہی لمحے میں سرلا زمین سے ایک فٹ کی اونچائی پر جھوٹتی ہوئی ہذیبانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

”واقعی تم کافی طاقتور ہو۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ مگر حمید کو فریدی کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔ وہ کسی خوبصورت عورت کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے وہ سیکرٹری کی طرف بڑھا۔

”کہاں چلے؟ چپ چاپ اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ میں تمہیں بھی.....!“

حمید جھلا کر پلٹا لیکن فریدی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

نی زندگی اور سفاکی تھی اس کے چہرے پر!

”اس کی وجہ سے شہر کی تقریباً چار سو لڑکیاں برباد ہوئی ہیں۔“ فریدی غرایا۔ ”ہر طرح برباد ہوئی ہیں، پی سنگ کے ایجنٹ انہیں اپنی مائیں یا بہنیں نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سب طالبات ہیں۔ ان کا مستقل تاریکیوں میں جا سویا۔ وہ اس لئے برباد ہوئیں کہ اپنی قوت حافظہ پر جلا کر بنا پاہتی تھیں۔ یہ مقصد پھر نشے کی عادت میں کھو گیا۔ حمید پیچھے ہٹ آؤ..... میرا بس چلے تو میں اس عورت کو کتوں سے نچوڑاؤں۔“

سرلا چیختے چیختے مضطرب ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسکے حواس جواب دے رہے ہوں۔

”اسے نیچے ڈال دو۔“ فریدی نے سیکرٹری کو حکم دیا۔ ”اور اب پی سنگ کو اتنا پیٹو کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے۔“

”نن..... نہیں۔“ سیکرٹری ہانپتا ہوا بولا۔

”میں تمہارے خلاف کوئی قتل نہیں ثابت کر سکوں گا کہ تمہیں پھانسی ہی ہو جائے۔“ فریدی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”لیکن میرے ریوالور کی گولی تمہیں موت سے ضرور ہمکنار کر سکتی ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ پی سنگ جیسے مجرموں کو پکڑنے کے سلسلے میں ایک نہیں اگر دس آدمیوں کی جانیں بھی تلف ہو جائیں تو محافظوں کو خوشی ہی ہوگی..... کیا سمجھے۔“

سیکرٹری چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر پی سنگ پر ٹوٹ پڑا۔ پی سنگ کے منہ سے گالیوں کا طوفان امنڈ پڑا۔ ایک بار پھر حمید کی نظروں کے نیچے ویسا ہی ڈرامہ شروع ہو گیا جیسا کچھ دن پہلے وہ ایک ویرانے میں دیکھ چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے اور ان کے انداز میں وحشت تھی۔ وہ دو اجنبی کتوں کی طرح غرا غرا کر ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے اور حمید پاگل ہوا جا رہا تھا۔ آخر فریدی کو ہو کیا گیا ہے۔ اس نے یہ کون سا طریقہ ایجاد کیا ہے۔

اچانک ان دونوں کے شور میں فریدی کی آواز ابھری۔ ”تم دونوں اس وقت اُن لڑکیوں سے بھی بدتر نظر آ رہے ہو جو تمہارے نیچے عرق کا شکار ہو کر جانوروں کی طرح بے عقل ہو جاتی ہیں..... مارو ایک دوسرے کو۔ اچھی طرح توڑو، اگر کسی کے بھی ہاتھ ست ہوئے تو وہ موت کی گود میں جا سوائے گا۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو نوچتے اور بھنبھوڑتے رہے۔ پی سنگ کو غالباً اس بات پر غصہ تھا کہ اُس کا ایک ملازم اُسے پیٹ رہا ہے اور سیکریٹری؟ اسے موت کا بھی خوف تھا اور پی سنگ پر غصہ بھی کیونکہ وہ انتہائی زیرک ہونے کے باوجود بھی فریدی کے جال میں پھنس گیا تھا۔

یہ جنگ تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ حمید پر اکتاہٹ طاری تھی۔ سرلا ہوش میں آگئی تھی اور اب ایک کونے میں منہ ڈالے ہوئے کسی سردی کھائے ہوئے بکری کے بچے کی طرح کانپ رہی تھی۔

پھر دونوں تھک کر گر گئے۔ وہ سر سے پیر تک خون میں نہائے ہوئے تھے۔

کمرے کا سناٹا بڑا بھیانک تھا۔ حمید کو ہزار ہا سال پہلے کا آدمی یاد آ رہا تھا۔ وحشی اور جانوروں کی سی حس رکھنے والا۔ اُس نے فریدی کی طرف دیکھا اور کانپ گیا۔ سرلا پھر بیہوش ہو گئی تھی۔ دوسری صبح پی سنگ کے سارے اڈوں پر چھاپے مارے گئے۔ اُس عرق کی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی۔ اس کے علاوہ لاتعداد غیر قانونی طور پر مہیا کی ہوئی چیزیں۔ ڈاکٹر زیدی نے اُس عرق کا تجربہ کر کے بتایا کہ وہ سو فیصدی وہی عرق تھا جس کا فارمولا سرلانے اس کی لیبارٹری سے چلایا تھا۔ پھر فریدی نے اس عرق کا تجربہ خود اپنے اوپر کیا اور اپنی باضابطہ رپورٹ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا۔ ”اگر اس کے نشے کی حالت میں غصہ آجائے تو پھر آدمی کو ہوش نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ یہ کیفیت صرف تھوڑی دیر تک رہتی ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس مدت کا انحصار آدمی کے مزاج اور اس کی جسمانی قوت پر ہو۔ کمزور آدمیوں کو جلد ہی غصہ آتا ہے اور جلد ہی رفع بھی ہو جاتا ہے۔ طاقتور دونوں ہی صورتوں میں زیادہ وقت لیتے ہیں۔ بہر حال غصے کی کیفیت رفع ہونے کے بعد نشے کے اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں اور نشے سے پہلے کی سی کیفیت لوٹ آتی ہے۔“

حمید کو اس کیس میں صرف دو ہی واقعات زیادہ اہم معلوم ہوئے تھے اور وہ دونوں واقعات وہی تھے جن میں فریدی نے آدمیوں کو کتوں کی طرح لڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حمید نے اس کی وجہ بہت پوچھی لیکن ہر بار فریدی کا یہی جواب ہوتا۔ ”میں تفریح کے موڈ میں تھا۔“

ختم شد